تیسرا ایڈیشن

مرتبہ

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

صدر شعبہ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

شائع کردہ

ادارۂ فروغ اردو

۳۷، امین آباد پارک لکھنؤ

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت

دو روپے

پہلا اڈیشن :- جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

دوسرا اڈیشن :- دسمبر سنہ ۱۹۵۹ء

تیسرا اڈیشن :-

فہرست مضامین

اپنے طلباء کے نام

عرضِ مصنّف

میری مختصر تقریروں کا یہ مختصر مجموعہ زیادہ تر ریڈیو والوں کا مرہونِ منّت ہے اس لئے نہیں کہ ان لوگوں نے ان تقریروں کے چھاپنے کی اجازت دیدی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ان کی فرمائشات پر مجھ ایسے کوتاہ قلم نے کچھ تو قلمبند کر لیا ویسے فرمایش پر غزل کہنے کے تو میں ہمیشہ خلاف رہا لیکن بعض اوقات آدمی مجبور کر دیا جاتا ہے کہ اِدھر اُدھر سے جمع و تفریق اور ضرب و تقسیم کر کے کچھ نہ کچھ جواب لائے اور اس آورد کو آمد کا لباس پہنائے ایسا ہی کچھ عمل میری ان فرمائشی، تقریروں، میں بھی آپ پائیں گے۔

ریڈیو نشرگاہ عجب مقام ہے جہاں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش بھی ہوتی ہے اور اس پر فہمائش بھی آزمائش یوں کہ موضوع کا تقرر ایک مصرعۂ طرح کی طرح دے دیا جاتا ہے آپکو خواہ وہ پسند ہو یا ناپسند آئیے اور دس پندرہ منٹ میں اپنے افکار پیش کر دیجئے مجال نہیں کہ مقررہ وقت سے ایک منٹ زیادہ ہو جائے اور فہمائش یوں کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسکا احتساب بھی ہوتا ہے کوئی فقرہ ایسا نہ لکھے جو کارکنانِ واکاش بانی، کی مرضی کے خلاف ہو جہاں زباں بندی کا ایسا دستور ہو کہ ناطقہ سر بہ گریباں ہو جائے تو جو منہ میں آئے وہ کیونکر کہا جائے۔ مجبوراً مختلف قسم کی ترکیبوں سے تقریر کا نصاب پورا کر دیا جاتا ہے۔
ریڈیو پر جب کبھی تقریر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے میری کوشش اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ موضوع اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی دلچسپی کا باعث

بن سکے کیونکہ ادبی موضوعات مخصوص ادبی حضرات ہی کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں انھیں عام پسند بنانے کے لئے یہی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں کہ انھیں آسان زبان اور عام فہم انداز میں پیش کیا جائے، مخصوص ادبی اشاروں اور کنایوں میں بات نہ کی جائے، کسی قسم کے ادبی پینترے نہ دکھائے جائیں اور یہ نہ فرض کر لیا جائے کہ ہمارے سننے والے بہت کچھ اس موضوع کے متعلق پہلے ہی سے جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان قیود کو اپنے اوپر عائد کر لینے سے مقرر کو نہ صرف زبان و انداز بیان کی عام فہمی پر توجہ دینا ہوگی۔ بلکہ بسا اوقات بعض ایسے اسرار و غوامض کو بھی نظر انداز کر دینا ہوگا جو صرف منتہی حضرات کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں وقت کی تنگی بھی بات کو دور تک لے جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اسی لئے ان خود عائد کردہ خامیوں کے پیش نظر مجھے اندیشہ ہے کہ ادیبان کرام کو ان ادبی باتوں میں کوئی خاص چیز مشکل ہی سے نظر آسکے گی البتہ اسکی امید ضرور ہے کہ وہ لوگ جو اردو ادب کا ذوق تو رکھتے ہیں لیکن اس سے زیادہ ارتباط نہیں یا وہ طلبا، جنھوں نے حال ہی میں اردو ادب و ادبیات سے دلچسپی لینا شروع کی ہے ان سب کو اس ادبی گفت و شنید میں کچھ نہ کچھ تعارفی سامان ضرور مل جائے گا۔

کتاب کا نام کتاب ہی کے ایک عنوان سے ماخوذ ہے یہ عنوان ذرا گمراہ کن ہے اس لئے کہ اس موضوع میں اتنی سمائی ہے کہ اس پر ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں ایک مختصر تمثیلی مضمون میں اس کے ساتھ انصاف ہونا محال ہے پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ بعض نقاط نظر مختصراً ہی سہی، سامنے تو آسکیں تاکہ طلبا خود ان باتوں کو سامنے رکھ کر کچھ اور بھی اور کچھ آگے بھی سوچ سکیں ایک دوسرا تمثیلی مکالمہ بعنوان "شاعر" بھی اسی مقصد کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

نورالحسن ہاشمی لکھنؤ یونیورسٹی

ادب کیا ہے؟

[خیالستان ریڈیو پر شعر و ادب کی ماہیت پر گفتگو تھی خاص خاص
نکتے جو مختلف قسم کے اصحاب الرائے کی زبانی سنے گئے زیب قرطاس کر لئے
گئے صریر خامہ نوائے سروش ہے آپ بھی سنیئے شاید آپ کو بھی ان میں
لطف حاصل ہو]

شاعر:۔ دنیا کی ہر حقیقت وہ مرئی ہو یا غیر مرئی، اپنے حسین ترین اظہار کے لئے بیتاب ہے
اور اس وقت تک بیتاب رہے گی جب تک وہ اپنے اظہار کے حسین ترین نقطہ پر نہ
پہنچ جائے ہم لوگ محض ایک ذریعہ ہیں جو اس اظہار کو حسن کی ایک منزل سے دوسری
منزل تک پہنچاتے رہتے ہیں اور اس وقت تک پہنچاتے رہیں گے جب تک ہر حقیقت
اپنے آخری اور حسین ترین روپ میں ظاہر نہ ہو جائے۔

ہم پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم زندگی سے ہٹ کر باتیں کرتے ہیں۔ یہ انکے

متعلق تو صحیح ہے جو صرف موزوں طبع ہیں لیکن واقعی شاعروں کے متعلق ایسا کہنا غلط ہے سچا اور پکا شاعر زندگی سے ہٹ کر نہیں بلکہ زندگی سے بلند ہو کر باتیں کرتا ہے۔ شاعری وقتی یا عصری زندگی کا اظہار نہیں بلکہ خود حیات کا اظہار ہے شاعری حیات ہے اور قوت حیات، نشوونما پاکر جس طرح رنگا رنگ صورتوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے ہر جگہ نئے نئے بوقلموں رنگوں میں آشکارا ہوتی رہتی ہے حسین حسین جلوے اس طرح دکھاتی ہے جیسے وہ خود حسن کے ہر ممکن روپ کو آزما رہی ہو، اسی طرح سے ہمارا قلم ہے جو دراصل فطرت کا قلم ہے ہم محض ایک ذریعہ ہیں جس کے واسطہ سے حسن کے ہر گوشے روشن ہوتے رہتے ہیں۔ ہر شاعر حسن کا بندہ ہے یا حسن کا ایلچی۔ جو دنیا میں اپنی ذاتی یا انفرادی زندگی لے کر نہیں آیا ہے بلکہ حیات خود مجسم ہو کر آتی ہے اپنا جمالی روپ دکھانے کے لیے ہم محض تابندگی ہیں اور کچھ نہیں ہم حیات ہیں حیاتی نہیں کلی ہیں ذاتی نہیں قدرت ہیں قدرتی نہیں، ہم خود حسن ہیں اور حسن کی طرف جاتے اور لیجاتے ہیں۔ ہم نور ہیں اور نور آفریں بھی، زندگی کا اجالا ہم سے ہے اور ہم سے یہ نہ پوچھو کہ یہ اجالا ہم کیونکر پیدا کرتے ہیں۔

زندگی، کثافتوں اور لطافتوں کے مجموعے کا نام ہے ہم کثافتوں سے نفرت کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ کون نہیں کرتا البتہ ان کی بات نہیں جن کی روحوں میں غلاظت بھر گئی ہو یا جن کے ذہنوں پر سڑاہند چھا گئی ہو ہم صرف مجسم روح ہیں نافہم اور غلط اندیش لوگ ہم کو حیوان دیکھنا چاہتے ہیں انسان نہیں، خدا ان کی عقلوں پر رحم کرے۔

نقاد:۔ آیئے ہم ذرا دیکھیں کہ شعر وجود میں کیسے آتا ہے یعنی شاعر کے وجدان کو

سمجھنے کی کوشش کریں۔ دیکھئے شاعری یہی تو ہے ناکہ لفظ میں حسن ترتیب الفاظ میں حسن اور خیال میں حسن شاعر کی طبیعت کو ایک سمندر فرض کیجئے جس میں ترتیب سے موجیں اٹھتی رہتی ہوں اسی کو اس کی موزونیٔ طبع کہہ لیجئے۔ پھر جس طرح سمندر میں موجیں کبھی خود اس کے مدوجزر کے باعث اور کبھی خارجی ہواؤں کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں اسی طرح شاعر کی طبیعت میں موجیں کبھی اس کی اپنی اندرونی شورشوں کے باعث اور کبھی بیرونی تاثرات یا خیالات کے سبب سے پیدا ہوتی رہتی ہیں انھیں موجوں کو جب وہ آوازوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے تو شعر و شاعری ظہور میں آتی ہے پھر جب شاعر سکون کی حالت میں ان پر حک و اصلاح کرتا ہے تو اسے فن کاری کہا جاتا ہے تو گویا شاعر کی تخمیر میں جذبہ، احساس یا خیال اور پھر سلیقہ، یہ تینوں چیزیں ضروری ہیں۔

طبیب :۔ قطع کلام ہوتا ہے، جذبات صحیح اور پرزور اسی وقت پیدا ہوں گے جب انسان کامل طور پر تندرست ہو اس لئے شاعر کے لئے مکمل تندرستی ضروری اور اسکے اعصاب کے لئے صحیح اور مقوی دوائیں اور غذائیں نہایت ضروری ہیں۔

نقاد :۔ مجمع حسینان اور خوبصورت مناظر بھی اس کے اعصاب کو بغیر اچھی اور قیمتی دواؤں اور غذاؤں کے عرصہ تک درست اور موزوں رکھ سکتے ہیں ــــ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ صحیح اور سچے قسم کے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک قلب متاثر ہونے والا رکھتا ہو ایک روح بھڑک اٹھنے والی اور ایک شعور ترتیب دینے والا جس شاعر میں یہ تینوں صفات جس حد تک مکمل ہوں گی اسی قدر وہ شاعر مکمل ہوگا ہم نقاد لوگ کسی شاعر یا ادیب کے فن پاروں کو انھیں بنیادوں پر پرکھتے ہیں۔

طبیب :۔ (آہ سرد بھر کر) شاعر اور ادیب! وہ دبلے پتلے مریض قسم کے ادیب جن کے

جسموں میں خون اس قدر کم ہے کہ وہ زیادہ لکھ نہیں سکتے اور جتنا لکھتے ہیں اس میں ایجاز واختصار اور فن کو سمو دیتے ہیں تاکہ کمی نہ معلوم ہو! اپنی اس قسم کی تحریروں کو کبھی وہ افسانہ، کہتے ہیں کبھی خاکہ کبھی رپورتاژ۔ یاد آیا یکہ جب لوگوں میں خون کی فراوانی تھی اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوزی تھی وہ لوگ بڑی بڑی داستان بیان کر سکتے تھے نہ سن سکتے تھے، ہائے وہ طلسم ہوشربا کے دن! یاد آیا یکہ جب آبادی کم تھی اور خوراک زیادہ بڑھتی ہوئی آبادی کو صرف قحط اور وبائیں کم کردیتی تھیں۔ اب تو آبادی زیادہ ہے اور غذا کم ہر شخص جینا چاہتا ہے تو لڑائیاں کیوں نہ ہوں سیاسی لڑائیاں اور ذہنی لڑائیاں اعصاب مفلوج کیوں کر نہ ہوں اور ہمارا ادب پریشان خیالی کا مجموعہ ہو کر کیوں نہ رہ جائے؟

نقاد:۔ یاد آیا یکہ جب آپ کی طبابت خوب چلتی تھی۔ (قہقہہ)

ماہر نفسیات:۔ صاحبو، میں شعر وادب کے فن سے تو واقف نہیں، البتہ نفس انسانی سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور ہے اور چونکہ نفس انسانی کا تعلق ادبیات سے براہ راست ہے اس واسطے ضمناً کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

زندگی کے متعلق جو کچھ میں اب تک سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ زندگی کا نام اور قیام جذبات سے ہے اور جذبات عناصر کی طرح چند خارجی اصولوں کے پابند ہوتے ہیں پانی بلند سطح سے نشیب کی طرف ضرور رواں ہوتا ہے یہ ایک اصول ہے ہوا اونچے دباؤ سے نشیبی دباؤ کی طرف ضرور چلتی ہے یہ ایک اصول ہے جذبات بھی ہوا اور پانی کی طرح بلندی سے نشیب کی طرف رواں ہونے میں اپنی ہستی محسوس کرتے ہیں ہر شخص اپنے جذبات یا اپنے پروردہ جذبات افکار کو بلندی پر دیکھنا چاہتا ہے اسی لئے

احساس برتری انسان کی بنیادی کمزوری اور اس کی اولین اور آخریں مجبوری ہے دنیا کے تمام ہنگامہ ہائے آرزو اور نعرہ ہائے دہو، اسی احساس برتری کے مرہون منت ہیں۔ فرائڈ نے جنسیات کو بنیادی کمزوری مانا ہے یہ اس کی کم نظری ہے جنسیات محض ایک پردۂ لذت ہے جو احساس برتری پر عناصر یا خلاق عناصر نے ڈال دیا ہے ماہر سے ماہر بوالہوس سے پوچھ لیجئے اس کو فخر ہوگا تو کثرت لذات پر نہ کہ کیفیت لذت پر جو ایک عام چیز ہے۔

جب برتری، بنیاد زندگی ٹھہری تو جو چیز اس برتری سے دور لے جائے میں اسے گریز کہتا ہوں اگر یہ گریز اس دوری کو دور تر کرنے کے لئے ہے یا اس برتری یا حقیقت کو بھلا دینے کے لئے ہے تو میں اسے مذموم قرار دیتا ہوں اور اگر یہ گریز وقتی ہے اور ستانے کے لئے تھکن دور کر کے تازہ دم ہونے کے لئے، تاکہ ہر دقت کا مقابلہ کر کے اس پر برتری حاصل کی جا سکے تو میں اس گریز کو حسن قرار دیتا ہوں اسلئے وہ ادب جو اس قسم کی گریز کا حامل ہو مفید ہے اور انسان کا بہت بڑا خادم اسی لئے میں اکثر اپنے بے تکلف دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ ادب زندگی کی کنیز ہے اس سے خدمت لو، اپنے سر پر نہ چڑھاؤ، اسے بازاری نہ سمجھو نہ تور، اگر اسے ایک سلیقہ شعار اور وفادار بیوی کی حیثیت سے رکھو گے تو تمھیں آرام و اطمینان بھی حاصل رہے گا اور کبھی کبھی مفید صلاح و مشورہ بھی۔ ہر کہ زن نہ دارد آرام تن نہ دارد۔ (قہقہہ)

ایک آواز:۔ اور بچے بھی اچھے پیدا ہوں گے (مزید قہقہے)

ماہر نفسیات:۔ ضمناً ایک بات اور عرض کردوں۔ دنیا ایک حسرت کدہ ہے یہاں کس کی اور کتنی آرزوئیں پوری ہوتی ہیں!؟ اسی لئے عموماً لوگ اپنی روح کی تسکین کیلئے

اپنی دنیا الگ بنا لیتے ہیں ایک خیالی دنیا، جہاں ان کو ہر وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے
جو ان کو واقعی حاصل نہیں ہوتی اور جہاں ان کی ہر آرزو تسکین پاتی جاتی ہے وہ نقلی
تسکین ہی سہی اگر قدرت ہر شخص کے ذہن میں آرزوؤں کی اس خیالی تسکین کا انتظام
نہ کرتی تو یقیناً یہ دنیا انسانوں کے لئے محض ایک وسیع پاگل خانہ ہو کر رہ جاتی
شعر و ادب یقیناً ہمیں پاگل ہونے سے بچاتا ہے اور یہ انسانیت پر اس کا بہت
ہی بڑا احسان ہے۔

سائنسداں:۔ تمھارا ادب اور ادبیات محض بات کا بتنگڑ ہے بات ذرا سی ہوتی
ہے اسے تم بتنگڑ بنا کر بیان کرتے ہو اور اسے حسن بیان کہتے ہو یعنی تمھارے بیان میں
حقیقت ذرا سی ہوتی ہے اور حسن بیان زیادہ یا نامناسب حد تک زیادہ، اور بعض
اوقات محض حسن بیان ہی ہوتا ہے اور حقیقت کچھ بھی نہیں حسن کی یہ نامناسب
زیادتی کسی ذرا سی حقیقت سے وابستہ کر دینا یا فقط حسن بیان کی چمک خواہ مخواہ
دکھلانا اپنی قوتوں کا اسراف محض ہے یا اپنی قوتوں کا کھوکھلا پن تم اسی حسن کے سہارے
جیتے ہو جو پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں ان کے جی میں بات نہیں پچتی۔ مجھے ایسی زندگی
میں دلچسپی نہیں تم زندگی سے دور رہتے ہو اور دور رہنے پر مجبور ہو ورنہ تمھارے
ہاں حسن پیدا نہیں ہو سکتا ادب اور ادبیات کے معنی زندگی سے دوری کے ہیں
ہم زندگی کے شہسوار ہیں اسے دور سے یا الگ سے دیکھ کر اس کی کہانیاں
نہیں لکھتے۔ ہم اپنی گرم روی میں سایہ و سرچشمہ نہیں ڈھونڈھتے۔

با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

کھوکھلے اور سطحی شاعر واہ لگھتے ہوئے فلسفیو، تمہاری باتوں تمہاری گپ کا انحصار

ہی زندگی کے فرار پر ہے تمہاری شاعری محض تمہارا رونا ہے اور تمہارا فلسفہ محض احساس کمتری کے چھپانے کی کوشش حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ زندگی کے قابل ہی نہیں اور اگر تم کبھی اپنے کو اس قابل بنا لوگے تو ادیب ہی نہ رہو گے ہمارے جیسے ہو جاؤ گے بس اس سے زیادہ میں اس بے ہودہ گوئی میں اپنا وقت خراب نہیں کر سکتا۔

[اٹھ کر چلا جاتا ہے]

نقاد:۔ خوب، حسن بیان کی برائی اور اس حسن بیان کے ساتھ!

استادِ فن:۔ شاعری موزوں طبعی کا نام ہے اس کے لئے نہ عشق کی ضرورت ہے نہ بھوکے رہنے کی صرف قوت تخیل ہونا چاہیئے شاعر کا تصور کہاں نہیں پہنچ سکتا اور کیا نہیں بن سکتا اور کیا نہیں کر سکتا۔ کیا ضروری ہے کہ وہ حسن و عشق کے کوچے میں اپنے قدم رکھے ضرور؟ ہم تصور سے تو اتنا کچھ سوچ سکتے ہیں جو واقعیت کے نام نہاد اہلکاروں کو عمل کی دنیا میں دکھائی بھی نہیں دے سکتا۔ شاعر کیلئے اصل چیز اظہار بیان ہے ایک حسین لب اظہار اور یہ چیز کچھ فطری صلاحیتوں اور بہت کچھ مشق سے آتی ہے جس کی طبیعت میں ذرا سی موزونی ہو یا خو الفاظ اور آوازوں کو ایک سلیقے سے برت سکے وہ مشق سے مکمل شاعر یقینی ہو سکتا ہے کچھ تصور کس کے پاس نہیں ہوتا مشق کے بغیر کوئی شاعر چاہے جیسی فطری صلاحیتیں وہ لایا ہو، استاد نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی جائے تو اس کو خود اپنے کلام کو پختہ بنانے میں نہیں معلوم کتنے ہفت خوان سر کرنا پڑیں گے نہیں معلوم کتنے اور کس قسم کے تجربوں سے عہدہ برآ ہونا پڑے گا تب جا کر اس کی زبان میں روانی اور حسن پیدا ہو سکے گا۔ استادی اور شاگردی کا دستور اسی سے ہر قسم کے شاعروں کے لئے ضروری ہے خواہ وہ فطری ہوں یا صرف موزوں طبع کیونکہ صحیح تعلیم

کم وقت میں جلد پختہ بنا دیتی ہے اور انسان اٹکل پچو والے طریقہ سے جلد گزر جاتا ہے
ایک مریض حفظانِ صحت کے اصولوں پر کاربند ہو جانے سے بھی صحت یاب ہو سکتا
ہے لیکن وہ جلد تر اچھا ہو سکتا ہے اگر وہ دواؤں کا بھی سہارا لے آج کل وقت ہی
سب سے بڑی پونجی ہے اسلئے وقت کو کیوں نہ بچایا جائے یعنی شاعری بغیر شاگردی کے
ضرور کی جا سکتی ہے لیکن فنکاری مشکل سے آتی ہے اور جلد نہیں ہو نہار شاعر
مرحوم استادانِ فن سے بھی کسب کر سکتا ہے یہ بھی مناسب ہے لیکن ایک زندہ استاد
کی تعلیم بہر حال بہتر ہوتی ہے فن بغیر مشق کے نہیں آتا شاعری کا فن الفاظ اور
اصوات کی ترتیب پر منحصر ہے اس لئے جب تک اس کے گروں سے واقفیت نہ ہو
شاعری محال ہے طبیعت میں اپچ چاہے جتنی ہو حسن پیدا نہ ہوگا جب تک فن کاری
کا فن نہ آتا ہو۔ زندگی جوشِ نمو سے پھول تو پیدا کر دے گی لیکن جب تک ان پھولوں
کو سجایا نہ جائے گلدستہ نہ بنایا جائے زلفِ سخن کی مشاطگی نہ کی جائے عروسِ سخن
کو سنوارا نہ جائے حسن ممکن نہیں فطرت لالے کی حنابندی ضرور کرتی ہے لیکن حسنِ
فطرت بھی دست کاریِ انسان کا محتاج ہے۔

مری مشاطگی اب درس دے گی حسنِ فطرت کو
یہ داغی ہے لالے میں فقط نقصِ حنابندی

حکیم :- بھئی مجھے شعر و ادب کے متعلق تو زیادہ معلومات نہیں اتنا البتہ جانتا ہوں کہ
شعر و ادب محض زائد قوتِ غریزی کا اظہار یا انتشار ہے جس طرح وہ آگ جس میں
حدت زیادہ ہوتی ہے لو دینے لگتی ہے اسی طرح زندگی ایک شعلہ ہے زائد قوتِ
حیات نفسِ انسانی میں لو دیتی ہے تو اس کے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں یہی حرارت

جب آواز میں تبدیل ہو کر ایک سلیقے سے اظہار پاتی ہے تو شعر و ادب کہلاتی ہے ترنم میں ڈھالئے تو موسیقی، صورت میں تو مصوّری حرکات بدنی میں تو رقص غرضکہ تمام فنون لطیفہ اسی زائد حرارت غریزی کا لطفِ اظہار ہیں اور اسی لئے یقینی یہ تندرستی کی علامتیں ہیں روح اور جسم دونوں کی۔

اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موج زندگی ÷ جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں

برخلاف شاعر کے فلسفی کی حرارت غریزی کو دبے کو محض ایک انگارے کی صورت میں سلگتی اور دہکتی رہتی ہے اسی لئے اس کی روح کی چستی اور جسم کی درستی میں وہ چمک یا شعلہ دستی باقی نہیں رہتی بلکہ بیشتر تو اتنی بجھ جاتی ہے کہ خراب ہو جاتی ہے میرا بس چلے تو میں سارے انسانوں کو شاعر بنا دوں کیونکہ شریعت نہایت فطری چیز ہے اور فطرت کا بہترین عطیہ بھی اس سے آدمی کا دل خوش و خرم، چاق و چوبند رہتا ہے اور اس کا نفس درخشاں، ہلکا اور مطمئن۔ صحیح تندرستی کے لئے اور کیا چاہئے!
افلاطون کی سمجھ الٹی تھی یا یوں کہیئے کہ وہ خود شاعر تھا اس لئے اس نے محسوس نہ کیا کہ وہ فرد اور جماعت دونوں کے ساتھ کس قدر ظلم اور کس قدر صریحی نفسیاتی غلطی کر رہا تھا کہ چمن سے شاداب پھولوں کو نکال کر اس میں محض گکرمتے بو دینا چاہتا تھا۔

ایک بات کا اور خیال رہے جہاں چمن فطرت کا یہ حسین ترین پودا یعنی شاعری اپنی زائد حرارت غریزی کے اظہار و انتشار سے اپنی زندگی میں تابندگی پیدا کر سکتا ہے وہاں اس کا بھی ڈر ہے کہ وہ اسی اظہار کے ذوق و شوق میں حد سے زیادہ بڑھ کر کہیں اپنی لطیف حرارت اور قوتِ حیات کے ساتھ

فضول خرچی اور عیاشی شروع نہ کر دے اس صورت میں شاعر کی تندرستی اور شاعری دونوں بننے کے بجائے بگڑ جائیں گی اور وہ سماج کا ایک ناکارہ جزو ہو کر رہ جائے گا۔ ایک فن کار کو اپنی قوت حیات و تخلیق کے استعمال میں احتیاط ملحوظ رکھنا از بس ضروری ہے تاکہ اس کی تندرستی اور توانائی اور اس کے دل، و دماغ کی صحت و رعنائی برقرار رہ سکے۔

صوفی:۔ ادب شستہ حسن کاری ہے حسن کہاں نہیں اور ہم کب اس کے متلاشی نہیں رہتے۔ ہر بات میں نفاست، ہر چیز میں سلیقہ، ہر شے میں خوبی و خوشنمائی ڈھونڈنا ہماری فطرت میں ہے اسی طرح سے خیال یا اظہار خیال میں بھی رعنائی کا ذوق کارفرما ہے اور اسی کو ادب کہہ لیجئے یہ حسن پسندی ایسی چیز ہے کہ ہر قسم کی جبلتوں اور ہر قسم کی روحانی کاہشوں پر حاوی ہے یہ حسن ہماری فطرت میں ہے بلکہ خود ہماری فطرت ہے۔ اس پر ہماری جسمانی جبلتوں کے بادل اکثر گھر آتے ہیں اور وقتی طور پر یہ نور یہ خورشید آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن جہاں یہ وقتی بادل چھٹے یہ نور پھر اپنی پوری چمک دمک سے جلوہ افروز ہونے لگتا ہے صفائی، سلیقہ، ترتیب، تہذیب سب اسی کے مظاہر ہیں اور کیا تم اس قوم کو برتر نہیں سمجھتے جس میں یہ صفات موجود ہوں؟

حسن صرف ہماری ذات ہی نہیں بلکہ خود خدا سر تا پا حسن ہے از اول تا آخر اللہ جمیل ہم خدا کو مکمل حسن سمجھتے جانتے اور مانتے ہیں یہ وہی نور ہے جو ازل میں تھا اور ابد تک رہے گا۔ زندگی اور اس کی شورشیں، کائنات اور اس کی سرگرمیاں، محض ایک وقتی دھند لکے ہیں جو زنگ کی طرح کسی آئینے پر آ گئے ہیں۔ ہماری زندگی ہم سب کا وجود محض کہر میں ایک غوطہ ہے اور اسی کہر کی زندگی کو ہم زندگی کہنے لگے ورنہ

دراصل ہم نور سے ہیں اور نور تک رواں ہیں یہ ظاہر قیام محض سفر ہے اور کچھ نہیں دیکھو تم جس چیز پر منطقی استدلال کرتے ہو تو نفی ہی پر پہنچتے ہو وہی نفی جو ہر جگہ جاری وساری ہے اور ہر ہست کی اصل ہے یہ نفی اسی حسن مطلق کی صفت ہے اور حسن کو اور کسی مثبت چیز سے نہیں ناپ سکتے اور اگر کسی مثبت طریقہ پر ہی چلو کثیف مادہ لطیف سے لطیف تر ہوتا جائے گا اور آخر کار ایک ایسے لطیف ترین مثبتی ایکائی پر ختم ہوگا جو نور مکمل و مجسم ہے اور جو تمام کثافت اور مثبت کی بنیاد ہے اور جسے ہم کسی منفی پیمانے سے ناپ نہیں سکتے۔

تو ہاں میں کہہ رہا تھا کہ جب حسن ہی اول و آخر حیات ٹھہرا اور انسانی زندگی کی اصل بنیاد، جو ہمارے ہر شعبۂ زندگی میں کسی نہ کسی صورت سے جاری وساری ہے تو ہم پھر کیوں نہ حسن ہی کو بنیاد حیات و ادب مان لیں جو روز روشن کی طرح عیاں ہے یہ حسن ہی ہے جو ہمارے خیال اور انداز کی تشکیل کرتا ہے اور اسی حسن کو محسوس کرنا اور بیان کرنا ہماری فطرت میں ہے اور ہر ادیب اتنا ہی بڑا ہوتا ہے جتنا یہ حسن اس کی روح کو تفویض ہوتا ہے اس لئے حسن معنی اور حسن انداز (جو دراصل ایک ہی چیز ہے) کے علاوہ کسی اور وقتی معیار کو اساس بنایا گیا تو وہ محض وقتی ہوگا جس کی حیثیت محض تاریخی ہوگی حسین چیز ہمیشہ پسند آئے گی اور ہر ایک کو پسند آئے گی اگر حسن کسی کو مرغوب نہ ہو تو سمجھو کہ اس کے ذہن میں کچھ فتور ہے صحت مند زندگی بغیر حسن فہمی اور حسن آفرینی کے ممکن نہیں تاج محل کو بنانے والے اور اس سے لطف لینے والے ہی صحت مند انسان ہیں مختصر یہ کہ حسن ہی بنیاد حیات و ادب ہے

مزدور:۔ ادب اور ادبیات سب فرصت کی باتیں ہیں، ذہنی تعیش اور ذہن کی

سرمایہ داری! ہم لوگوں کو اتنی فرصت کہاں کہ قرینے سے ہنس بول سکیں یا جی بھر کے رو ہی سکیں ہم تو بیل کے مانند ہیں جسے ہمہ وقت تن کی فکر میں من لگائے رکھنا پڑتا ہے وہ لوگ جن کے پاس ہنسنے رونے یا باتیں بنانے کا وقت ہے یا جن کے پاس جذبات میں شدت پیدا کر لینے کی فرصت ہے وہ جو باتیں چاہیں بنالیں ے

یہاں دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا

ہم جانوروں کی مانند ہیں جس کی سب سے پہلی اور سب سے آخری فکر پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی ہوتی ہے ہم اپنے کھانے کی فکر میں اس قدر لگے رہتے ہیں کہ بالآخر یہی فکر ہمیں کھا جاتی ہے ادب اور ادبیات تو دل بہلانے کی چیزیں ہیں ہمارا دل بہلاوا صرف ہماری شریک حیات تک محدود ہے اور پھر اس دل بہلائے کے خمیازے میں بھی ہمیں اس کے اور اپنے بچوں کے آذوقہ کی فکر الگ کرنا پڑتی ہے اب آپ ہی بتائیے ان حالات میں ہم اپنی فکر کو کیسے مہلت دیں کہ وہ ادھر ادھر بھٹک کر گل و بلبل یا چاند ستاروں میں اپنے کو بہلا سکے ادب اور شاعری ذہنی سرمایہ داروں کے مشغلے اور پیشے ہیں بیکاروں کے کام ے

از ما بجز حکایت جہد و عمل مپرس

ایک مومن:۔ ادب خادم ہے مخدوم نہیں، ذریعہ ہے منزل نہیں۔ ہماری منزل تسخیر کائنات ہے۔ راستہ ہماری زندگی سے ہو کر ہے تم لوگ ابھی تک ادب اور زندگی کو منزل بنائے ہوئے ہو، یہ محض سنگ میل ہیں کائنات کی تسخیر بھی کوئی مقررہ منزل نہیں دراصل یہ ایک بے منزل کا راستہ ہے جس پر پہنچ جانا ہی وہ اطمینان عطا کر دیتا ہے جو منزل پر پہنچنے سے حاصل ہوتا ہے ــــ ادب زندگی کی تسخیر کا پہلا قدم

ہے افسوس ہے کہ لوگ اسے ابھی تک پہلا قدم بھی نہ جان سکے حالانکہ صحائف، ادب کے ذریعہ زندگی کی منزلوں کو عرصہ ہوا سر کر چکے، زندگی کے ازل اور ابد کو ہمیشہ کے لئے متعین کر چکے، ایک صحیفے نے تو ذاتی اور سماجی زندگی کے جزوی شعبے تک مقرر کر دیئے تھے لوگ ان راستوں پر چلے اور چلتے ہیں لیکن ان راستوں پر آگے نہیں بڑھتے، انھیں میں گھوم پھر کر الجھے رہتے ہیں ہاں وہ قومیں آگے بڑھ گئیں جنھوں نے تسخیر کائنات پر نظر رکھی۔

چلبلی دیوتا:۔ [ایک بہت موٹا، بہت چھوٹا شخص، قہقہہ لگاتا ہوا آتا ہے]

اسے ماں، یہ کیا تم لوگ خواہ مخواہ کی باتیں بنا رہے ہو۔ تمہارا ادب محض باتیں بنانے کا دوسرا نام ہے ہنسو اور موٹے ہو جاؤ، تمہاری تنقیدیں تمہاری تحریریں سب بات کے بتنگڑ ہیں کھاؤ پیو اور ہنسو، یہی زندگی کا مقصد ہے۔ فضول باتیں بنانے کو ایک پیشہ نہ بناؤ۔ زندگی کی تفسیر! زندگی کی تفسیر کیا معنی؟ سب فضولیات تم لوگ ادب اور زندگی دونوں کو خواہ مخواہ اہمیت دے رہے ہو، نہ یہ اہم ہے نہ وہ نہیں معلوم لوگ باریکی خیال اور سنجیدگی افکار کو کیوں برتری دے کر اپنے عقل و شعور، تخیل اور تصور کو مفت اور فضول خرچ کر ڈالتے ہیں خصوصاً وہ ادیب جو خواہ مخواہ کی فکروں میں اپنے کو گھلا ڈالتے ہیں اور وہ فلسفی جو زندگی کو اہم سمجھ کر سوکھا منھ بنائے رہتے ہیں۔ زندگی ایک حماقت ہے اور پھر اس پر ادیبوں کی خامی خوبی، پوپلی باتیں حماقت در حماقت! [زور سے قہقہے لگاتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا ہے]

ایک بودھ:۔ منتہائے کلام خاموشی ہے اور معراج گویائی، سکوت۔

شاعر

(ایک تمثیلی مکالمہ)

شاعر ایک چمن میں گلگشت کر رہا تھا، نہیں معلوم کن خیالات میں کھویا ہوا یکایک ایک تختہ چمن میں ایک گلاب کا پھول اسے دیکھ کر کھل کھلا پڑا شاعر نے معاً یہ شعر پڑھا ؎

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سنکر تبسم کیا

پھول (ہنس کر) میاں شاعر، میر اور میر کے زمانے والوں نے تو محض میری اور دنیا کی بے ثباتی پر ایک خوبصورت تبصرہ کیا تھا دراصل نہ میں بے ثبات ہوں نہ دنیا، تم کو اب میرے تبسم کا دوسرا مفہوم بھی سننا پڑے گا، وہ یہ کہ حقیقت میں میرا تبسم اس چینی دیوتا کے قہقہے کے مانند ہے جو دنیا اور اس کی بے ثباتی کا ذکر کرنے والوں پر صرف قہقہہ ہی لگا سکتا تھا زندگی اور دنیا کی اب نئی قدریں بن گئی ہیں، زندگی کو فانی کون کہتا ہے زندگی تو پائندہ چیز ہے ہمیشہ باقی رہنے والی، میرا یہ ظاہری روپ البتہ فنا ہو جائیگا امروز و فردا کی پیمائش کے اعتبار سے میرا قہقہہ البتہ تھوڑی دیر کے لئے گم ہو جائے گا، لیکن میں باقی

رہوں گا اور اسی طرح بار بار پیدا ہو کر قہقہے لگاتا رہوں گا کیا تم نہیں جانتے کہ زندگی کا مقصد محض تخلیق زندگی ہے، میں کلی بنکر نوخیز ہوتا ہوں، پھول بن کر جوان ہوتا ہوں اور پھر رنگ و بو میں مست رہنے لگتا ہوں، حالاں کہ یہ چند روزہ ہے، لیکن چند روزہ ہی سہی بے مقصد تو نہیں ہے ذرا نظر میں گہرائی پیدا کرو، اور دیکھو دنیا میں فطرت نے رنگ و بو، کو محض فریب نظر کے لیے نہیں بنایا ہے دراصل اس کا مقصد میری بقا ہے، بھونرے، تتلیاں، بلبلیں فطرت کے اس بظاہر فریب حسن میں آجاتی ہیں، جس کا ہالا اس نے میرے گرد کر رکھا ہے یہ ننھے معصوم قاصد دراصل میرے وہ اجزا میرے ہم جنس دوسرے پھولوں تک نادانستہ لے جاتے ہیں اور دوسروں کے میرے پاس لے آتے ہیں، جن سے مل کر وہ خزانۂ زندگی تیار ہو جاتا ہے جو میری زندگی کو آئندہ قائم رکھتا ہے نہیں معلوم قدرت کو رنگ و بو، کا یہ فریب کیوں پسند ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ زندگی کے اس تسلسل کا کاروبار دلچسپی، شوق، تمناؤں اور آرزوؤں سے پورا ہو سکے، اس کے بغیر تو دنیا صرف مشین ہو کر ہی رہ جاتی اور یہ زندگی کا چکر جلد ہی ختم ہو جاتا، کیونکہ بغیر لذت اور دلچسپی کے اپنی جان کون کھپاتا، نہ میں ہی ہوتا نہ تم ہی ہوتے اس لیے اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ زندگی کا مقصد محض بقاء زندگی ہے، اور میرے قہقہے، رنگینیاں، دلچسپیاں، غرضکہ رنگ و بو اور حسن و جمال کی تمام رعنائیاں نغمہ کی تمام خوش الحانیاں، محض اس زندگی کے مقصد کو خوشی، دلچسپی، شوق اور تمناؤں کے ساتھ پورا کرنے کے معصوم ذریعے ہیں، بظاہر یہ فریب لیکن

دراصل ضروری فریبے ہیں۔

زنقصِ تشنہ لبی داں بہ عقلِ خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

میرے شاعر تجھے معلوم ہے کہ تیرا فرض منصبی کیا ہے؟ تو جو حسن و عشق کی رنگین داستانیں بیان کرتا ہے تو کیوں؟ لوگ ان سے دلچسپی لیتے ہیں تو کیوں؟ صرف اس لئے کہ تیری روح میں وہی خلشِ حیات ہے جو اپنی بقا چاہتی ہے اور لوگ جو ان سے دلچسپی لیتے ہیں، وہ بھی اس لئے کہ ان کی زندگیاں، ان کی روحیں بھی بقا چاہتی ہیں، تجھے معلوم ہے کہ تو ایسے فرض کی انجام دہی میں مصروف ہے جو فطری قوانین کے لحاظ سے سب سے مقدس، سب سے اعلیٰ سب سے ارفع اور سب پر مقدم ہے، تو ان کی انجام دہی میں فطرت کی سب سے زیادہ اہم خدمت کر رہا ہے، خدا تجھے عمرِ جاوداں بخشے۔

شاعر۔ میرے پیارے پھول، غالباً تو طعنہ دے رہا ہے کہ میں تیرے کانٹوں تیری پتیوں، تیری جڑوں، تیرے گملوں، تیری آبیاری اور تیری کھاد کے متعلق شاعری کیوں کرتا ہوں، میرے پھول، میرے محبوب، دیکھ تو میں کیوں نہ ان مضامین پر اشعار لکھوں؟ تیری زندگی، تیرے حسن کا دارومدار تیری پرورش ہی پر تو ہے تیری رعنائی قائم تو انھیں بنیادوں پر ہے، یہ بنیادیں نہایت غیر شاعرانہ نہایت مکروہ اور بھونڈی سہی، مگر تیرے حسن، تیرے نور کی خاطر مجھے ان ظلمتوں پر بھی نگاہ رکھنا پڑتی ہے وہ بھی تو تیرے حسن کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس لئے جب میں ان میں کوئی نقص دیکھتا ہوں تو کیوں نہ روؤں، کیوں نہ چیخوں، کیوں

نہ فریاد کروں زندگی کا مقصد محض تخلیق زندگی نہیں، بقائے حسن زندگی بھی ہے اور بقا نہیں تو کچھ بھی نہیں، مجھے تیرے حسن کی بقا مطلوب ہے۔

پھول۔ ہاں میرے عاشق، میرے جمال کا دارومدار بہت کچھ میری پرورش پر ہے، اور تجھے ضرور دکھ ہونا چاہیئے جب تو دیکھتا ہے کہ میں حسین سے حسین تر کیوں نہیں ہوتا، لیکن میرے جسم کی پرورش کا کام تو باغبان کا ہے، اس لئے تو اپنے فرض منصبی یعنی بھونرے کی طرح حسن کی معرفت تخم ریزی کے، بجائے خود تخم ریزی کا کام کیوں سرانجام دینا چاہتا ہے اپنی حسن آفرینی یعنی اپنے زورِ قلم کو باغبانی کے فن میں کیوں صرف کرتا ہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

اور اسی تقسیم کار سے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں، تیرا اصلی فرض تو یہی ہے کہ میرے رنگ و بو کے جمال کو اپنے حسن کلام سے بڑھاتا رہے تاکہ میرے گرد بھونرے تتلیاں اور بلبلیں زیادہ سے زیادہ آئیں، اور میں زیادہ سے زیادہ صورتوں میں پیدا ہوتا رہوں یہاں تک کہ تمام دنیا گل و گلزار بنجائے۔

شاعر۔ پیارے پھول، تیری باتیں کس قدر حسین ہیں، لیکن صرف حسین، یہ تو تو نے خوب سمجھا دیا کہ شاعر کا کام محض تبلیغ حسن ہے لیکن تو ایک بات بھول گیا وہ یہ کہ شاعر ایک انسان بھی ہوتا ہے، اس لئے اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی صحیح اور صحت مند انسانیت بھی برقرار رکھے تو محض ایک پھول ہے، مجسم حسن، تجھے کیا معلوم کہ شاعر کے سینے میں ایک حوصلہ مند دل بھی ہوتا ہے، دل کی اس حوصلہ مندی کو عشق کا نام بھی دیا جاتا ہے، یہ عشق زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ زندگی پر اختیار

بھی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو نے مانا ہے کہ زندگی نام ہے بقائے زندگی کا، اور حسن اسی زندگی کے سلسلے کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، لیکن ہم اگر اسی تسلسل کے نغمے بناتے رہیں، اور گاتے رہیں تو ہم باقی تو ضرور رہیں گے، لیکن فطرت کے محض ایک غلام کی حیثیت سے، تجھے نہیں معلوم کہ ہم میں بقائے حیات کی خلش کے ساتھ ساتھ تسخیر حیات کی بھی جبلت ہے، جہاں ہم تیرے کہنے کے مطابق فطرتاً اپنی بقا کے لئے نغمے الاپتے ہیں، حسن و عشق کے گیت گاتے ہیں، وہاں اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ فطرت حیات پر بھی قابو پا جائیں، زندگی کو بہتر سے بہتر بنائیں نہ کہ تیری طرح صرف راگتے رہیں، حسین کرشمے دکھاتے رہیں اور فطرت کے غلام بنے رہیں، تجھ میں خود کو حسین تر بنانے کی نہ قوت ہے نہ جبلت تو ایک طرف فطرت کا غلام ہے، دوسری طرف انسان کا، شاعری ہمارے لئے جزو پیغمبری ہے اور تو جانتا ہے کہ ہمارے یہاں پیغمبر کسے کہتے ہیں، اسے جو بہتر سے بہتر زندگی کے پیغام لاتا ہے، ایسے پیغام جو زندگی کے غموں کو کم کریں اور مسرتوں کو زیادہ، جو زندگی میں حسن پیدا کریں، جو قدرت کی غلامی سے چھڑائیں اور زمین و آسمان پر قبضہ دلائیں یہاں تک کہ.........

پھول۔ قطع کلام ہوتا ہے، مگر میرے بھولے بھالے شاعر، معلوم ہوتا ہے۔ آج کل انسان کی زندگی خطرے میں ہے اس لئے وہ ہر جگہ پر زندگی کے فلسفے پیش کر رہا ہے، اور شاعر ہو کر غیر شاعرانہ باتیں کرنے لگتا ہے مجھے تو اپنی زندگی کی طرف سے کبھی فکر نہیں ہوتی، کیا اس لئے کہ میں انسان نہیں ہوں؟ بلکہ درحقیقت مجھے اپنے پیدا کرنے والی فطرت پر پورا بھروسا اور کامل اعتماد ہے، وہ میری پالن ہار

ہے میری پروردگار ہے میں پیدا ہوتا رہتا ہوں اور اس کثرت سے کہ مجھے فنا کا ڈر نہیں۔ میرے کانٹے سلامت رہیں، جو مجھے انسانوں اور حیوانوں سے محفوظ رکھتے ہیں ہم تیری مرحومہ اقتداری جبلت کی خاطر آپس میں لڑا نہیں کرتے، اس لئے تیری طرح ہمیں فنا کا ڈر نہیں، ہم خود بھی جیتے ہیں دوسروں کو بھی جینے دیتے ہیں، اس لئے نہ ہمیں پیغمبر کی ضرورت ہے نہ ہادی کی، ہماری مسرت اور حیات کی ضامن خود قدرت ہے، ہم خود اپنی فطرت کے خدا ہونا نہیں چاہتے۔ خدائی میں دردسر ہے اور الجھن، بندگی میں اطمینان ہے اور مسرت، سچی خوشی صحیح تقسیم عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے صحیح آداب زندگی کے لئے فطرت اور انسان دونوں کو اپنی حدیں برقرار رکھنی چاہئیں۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

شاعر۔ میرے پیارے پھول تو حسن مجسم ہو کر بھی عقلِ کُل کی باتیں خوب کر لیتا ہے، حالانکہ یہ تیرا مسلک نہیں، مگر یہ ضرور بھول جاتا ہے کہ ہر شاعر ایک انسان بھی ہوتا ہے اور شاعری پیغمبری کا جزو ہے۔

پھول۔ میرے بھولے دوست، تم نہ شاعری کو سمجھتے ہو نہ انسانیت کو صحیح انسان خود غرض نہیں ہوتا، اور نہ آزادی اور حکومت کی حرص میں اپنی فطرت سے ماوراء ہونا چاہتا ہے، شاعر کا کام تو محض حسن آفرینی ہے محض حسن و شباب کے نغمے سنانا، حسن اور رنگینیوں سے متاثر ہونا اور متاثر کرنا، دنیا کے گوشے گوشے کو اپنے حسن نظر سے رنگین بنانا اور چپہ چپہ پر حسن کی تلاش کرنا، اور یہ سب اسلئے

تاکہ تو فطرت کا وہ تقاضا پورا کر سکے جس سے تیری زندگی یا انسان کی زندگی قائم ہے، میں تجھ سے کہہ چکا ہوں کہ پھول کو حسین تر بنانے کا کام حسن کاری یا فن کاری ضرور ہے لیکن یہ کام باغباں کا ہے جنھیں تو اپنی زبان میں پیغمبر، ہادی رہبر، مصلح، یا بہتر انسان کہتا ہے، اگر باغبان شاعری سے یہ کام لیتا ہے تو یقیناً یہ طریقہ اس کے لئے بہترین ثابت ہوگا کیونکہ شاعر انسانی فطرت کے ہر پہلو سے واقف ہوتا ہے لیکن شاعر کا یہ مسلک نہیں اور نہ اس کی نیت ہونا چاہیئے کہ وہ باغبانی یعنی پیغمبری بھی کرے، شاعری پیغمبری کا جزو ضرور ہے لیکن پیغمبری شاعری کا جزو نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اب تک جتنے بھی خوب صورت شاعر گزرے ہیں تیری مزعومہ سوسائٹی اور انسانیت کے لئے ضرور مفید اور کارآمد ثابت ہوتے، لیکن تو میری بات کیوں ماننے لگا تیری سوسائٹی میں آج کل مختلف قسم کے انتشار ہیں تیرے انسانوں کی زندگی آج کل خطرے میں ہے، اس لئے تجھے اپنی شاعری میں زندگی اور پیغمبری ضرور یاد آئے گی اور اسی وجہ سے میں دیکھتا ہوں کہ تیرے شعر وادب کے کارخانوں میں مصلح، انقلاب پسند، ترقی پسند ہادی، لیڈر، مورخ، ادیب، غرض کہ مختلف قسم کے بت ڈھالے جارہے ہیں میری بات اچھی طرح سن لے، در اصل تیری سوسائٹی کو ایک انسان کی ضرورت ہے نہ کہ ایک شاعر کی، ایک ایسے انسان کی جو تیری سوسائٹی اور تیرے تمدن کو استوار کرے اور ان مادی اور روحانی کشاکش سے نجات دلائے جو انسانوں کو آج کل گھیرے ہوئے ہیں، اس انسانیت کی تلقین کے بجائے تو ہر ادیب کو انسان بنا دینا اور انسان ثابت کرنا چاہتا ہے، یہی تیری منطقی غلطی ہے، بس اے

میرے بھولے بھالے شاعر تیری خاطر میں نے بہت سی عقل کی باتیں کر ڈالیں، جو بقول تیرے میرا مسلک نہیں ہے لیکن کیا کروں یہ سب محض تیری خاطر، کیونکہ تو بہت بھولا بھالا ہے، اور لوگوں کے کہنے سننے میں جلد آجاتا ہے۔

شاعر۔ تو گویا تیرے نزدیک میرا مسلک محض حسن آفرینی ہے اور میرا موضوع محض عشق؟

پھول۔ ہاں، حسنِ نظر عشق ہی سے وابستہ ہے، حسن و عشق ہی تیرا بنیادی فن ہے، دل میں سوزِ عشق پیدا کر تو نظر حسن کی متلاشی ہو جائے گی اور اسی جستجو سے تیرے فکر و فن کی رعنائیاں ہمیشہ قوت اور جولانیاں حاصل کرتی رہیں گی اور اپنی تعریف سننا چاہتا ہے تو سُن!

شاعر انسانیت کا جوہر لطیف ہے، وہ اس پھول کی مانند ہے جو سرِ شاخ چمکتا ہے۔ اس تارے کی طرح ہے جو علی الصبح مشرق میں دمکتا ہے، اسے اس زمین سے کیا مطلب جو غلاظت کا ڈھیر ہے، اسے اس زندگی سے کیا غرض جو عبارت ہے کثافت سے، اس کا رتبہ اعلیٰ اس کا درجہ آسمانوں سے بلند تر ہے اس کا مقصد محض ضیا پاشی ہے محض حسن آفرینی، شاعر اور فطرت ہم نام ہستیاں ہیں، مصلح، ریفارمر اور پیغمبر، زندگی کے قواعد اور اصول بناتے رہیں، نیک بندے نیکی کرتے رہیں، ان سب کو دونوں جہانوں میں خوب خوب ثواب ملے گا۔ شہرت، دولت، اور نیکی کا احساس ان کا اجر ہوگا۔ شاعر اس نیک و بد سے ماوراء ہے، وہ حسن کا جویا ہے اور حسن کا پجاری، وہ سجدے کرے گا ہر اس نقشِ قدم پر جو حسین ہے اس کی روح کے ذرّے رقص

کریں گے، ہر اس کرن میں جو چمکتی ہے، وہ مسکرائے گا ہر کلی پر جو کھلنے کو ہے، وہ ہنسے گا ہر اس گلاب پر جو مسکراتا ہے، وہ مسرور ہوگا ہر اس سینہ پر جو شفاف اور پرشباب ہے، غرض کہ وہ نمونہ ہے ہمارے اس مذاق کا جسے حسن پرستی کہتے ہیں، اور واللہ کہ ہمارے اس مذاق میں ازل اور ابد گم ہیں،،

اتنا کہہ کر گلاب مرجھا گیا، اس کی پنکھڑیاں ہوا میں منتشر ہوگئیں، شاعر کے لبوں پر گلاب کی مسکراہٹ منتقل ہوگئی اور وہ یہ گنگناتا ہوا اپنے گھر لوٹ پڑا۔

"پھول غلام ہے اور فطرت کا پابند، وہ صرف شاعری ہی کر سکتا ہے، میں اپنی فطرت کیسے بدل سکتا ہوں۔ میں بندہ بھی ہوں خدا بھی، خالق بھی ہوں اور مخلوق بھی، فطرت کا محکوم بھی اور حاکم بھی، ہاں ازل اور ابد حسن میں گم ہیں، لیکن وہ ازل کا پابند ہے میں ابد کا حامل، بہتر ہے کہ تقسیم کار کر لوں جب آسمانوں پر ہوں تو خدائی کروں، جب زمینوں پر ہوں تو بندگی، بندگی میں جذبات ہیں اور جینے کا پورا لطف، اور آسمانوں میں محض نظم زندگی ہے زندگی نہیں، لیکن ہم کو جینا بھی ہے اور جینے کا لطف بھی اٹھانا ہے۔ شان یکتائی بھی خوب ہے اور لطفِ بندگی بھی پر کیف۔ میں چاند کو اپنے میں جذب کر لوں گا، اور سورج میں خود گم ہو جاؤنگا پھر حرارت اور چمک سے کائنات کو زندگی اور تابندگی بخشوں گا۔

یہی میرا کام ہے۔

میں اپنی خودی میں مست مثلِ خورشید　　خود زندہ و زندگی کی مجھ سے امید
خود دیدہ تمام و خود بنائے ویدن　　میں مایۂ سوز و ساز و گفت و شنید

سوسن باغ کے دروازے پر پہونچی ہوئی تھی یہ سنکر اس سے بھلا کب رہا جاتا، زیر لب بڑ بڑا ہی اٹھی۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

اقبال کا نظریۂ شاعری

اقبال کا نقطۂ نظر ان کی اپنی شاعری کے متعلق سمجھنے میں یوں اور بھی آسانی
ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

شاعر کو، تو ہم لوگ ہمیشہ سے ایسا شخص سمجھتے آئے ہیں جو ہر وقت عالمِ خیال
میں رہتا ہو، کھویا کھویا سا اپنی دنیا الگ بنائے الفاظ کی بندش کے لئے پریشان
محاورات کے چکّر میں گم اور مضمون کی تلاش میں دیوانہ۔ باتیں جب کرے
تو کوشش یہ ہو کہ منھ سے پھول جھڑیں، کلام جب سنائے تو خواہش یہ ہو کہ
لوگوں کا سامعہ کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب جائے اور تحسین و آفریں سے
محفل کی چھتیں اڑ جائیں جس چیز کی وہ تصویر کھینچے بڑی رنگین بڑی خوبصورت
دل فریب معلوم ہو حالانکہ ہمہ وقت ہم سمجھتے بھی رہیں کہ اس کی یہ سب

باتیں خیالی اور بناوٹی ہیں عموماً شاعر کی شخصیت سے ایک ایسی ہستی مراد رہی ہے جس کے قول و فعل کا اعتبار نہیں جو کچھ وہ کہتا ہے کبھی کرتا نہیں، یعنی شاعر سے مراد گویا ایک جھوٹا شخص رہا ہے جو محض باتیں بنانے کا بادشاہ ہوتا ہے چند خوشنما الفاظ فضا میں بکھیر دیتا ہے جو آتشبازی کی طرح تھوڑی دیر چمک دمک دکھا کر اور لوگوں کو رجھا کر معدوم ہو جاتے ہیں صرف دو چار لمحوں کے لئے ایک ماہتابی آسمان پر چمکتی ہے لوگ تعریف و توصیف کے نعرے بلند کرتے ہیں کہ واہ کیا خوب روشنی ہے اور پھر کچھ نہیں، دوسرے الفاظ میں شاعری سے مراد ہمیشہ خوب صورت جھوٹ یا جھوٹا حسن رہا ہے، اقبال اسی نظریۂ شاعری کے سخت خلاف ہیں ایسے شعرا جن کا مقصد ہی محض اس قسم کی تفریح ہو یا جنکی غایت صرف یہ ہو کہ چند حقیقت نما حسین دروغبافیاں پیش کر دی جائیں وہ ایسے شعراء کے زمرے میں اپنا شمار بھی نہیں چاہتے کئی دفعہ انھوں نے شکایتیں کی ہیں کہ ان کو اس قسم کا شاعر نہ سمجھا جائے ؎

او حدیثِ دلبری خواہد زمن	رنگ و آب شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیٔ جانم نہ دید	آشکارم دید و پنہانم نہ دید

یا

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد	کہ داد کا نہیں طالب یہ بندۂ آزاد
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی	کہ بانگ صور اسرافیل دل نواز نہیں

اس میں شک نہیں کہ عرصہ تک اقبال نے بھی اس قسم کی شاعری کی تھی جس کا مقصد داد طلبی ہوا کرتا ہے اور جس کی نوا میں ادائے محبوبی اور دلبری

بے تاثیری ہوا کوئی ہے شاعروں میں داد دی تھی، حریفوں کے غل و شور سے چھتیں اڑیں تھیں۔ لیکن اقبالؔ کو ہوش آیا اور ان کے علم و فکر نے ان پر زندگی کے ٹھوس حقائق روشن کئے آنکھیں کھلیں تو ان کو محسوس ہوا کہ شاعری کا وہ نظریہ جس کا مقصد صرف حسن آفرینی ہو محض دکھاوے اور نمائش کی چیز ہے۔ اس سے خوشی تو پیدا ہوتی ہے لیکن وہ ایسی خوشی ہے جس سے ذہن پر کاہلی مسلط ہو جاتی ہے بالکل ایسی سرخوشی جیسی افیون کی چسکی میں حاصل ہوتی ہے وہ ہنر جو برائے تفریح۔ دیا جسے آرٹ برائے آرٹ کہا جاتا ہے، اقبالؔ کے الفاظ میں محض ایک فتنہ ہے جو زوال اور پستی کے زمانے میں ہم کو زندگی اور ترقی سے محروم رکھنے کے لئے اٹھایا جاتا ہے، اقبالؔ یہ نہیں کہتے کہ کسی شاعر یا کسی آرٹسٹ کے یہاں حسن آفرینی ہونی ہی نہیں چاہئے نہیں، وہ تو مقدم چیز ہے اگر خوبی و خوشنمائی ہو تو کلام میں حسن اور دلکشی پیدا ہی کیونکر ہوگی شاعر کا سینہ تو حسن کا تجلی زار ہونا چاہیئے۔ یہ اس کی نگاہ ہی کا تو اثر ہوتا ہے کہ خوب خوب تر نظر آتا ہے اور حسین حسین تر۔ لیکن اقبالؔ کے نزدیک محض یہ حسن آفرینی ہی شاعر کا مقصد نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے ان حقائق کو آشکار کرنے کا جو ہماری زندگی میں بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ شاعر کا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ حسن کے آئینہ میں کچھ حقیقتیں دکھلائے ایسی حقیقتیں جن سے بنی نوع انسان کو روحانی اخلاقی یا سماجی کسی طرح کا فائدہ پہنچے۔ حسن کی آڑ میں یا حسن آفرینی کے سہارے چند ایسے راز آشکارا کئے جائیں جو انسان کی زندگی میں قدر و قیمت رکھتے ہیں اور جس کے سننے سے۔ لوگوں کے دل و دماغ تازہ

ہو جائیں ان کی رگوں میں صحت پرور پرجوش خون دوڑنے لگے۔

لیکن شاعری میں یہ جوش پیدا کیونکر ہو کہ جو بات کہی جائے اس کے اثر سے سننے والوں میں بھی حرارت پیدا ہو جائے؟ اقبالؔ کہتے ہیں کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب شاعری کا دامن زندگی کے ساتھ بندھا ہو، جب شاعری تفسیر زندگی ہو ؎

اے میان کیسہ ات نقد سخن — بر عیار زندگی اُو را بزن

اور یہ زندگی کے ساتھ وابستگی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ شاعر کے دل میں خلوص ہو اگر دل میں جوش نہیں، خلوص نہیں یا وہ صداقت نہیں ہے جو بیک وقت ذوقِ لطیف کو آسودگی بخشتے اور زندگی کو تابندگی بھی، تو ظاہر ہے کہ اس کا کلام بھی اثر کی تاثیر سے محروم رہے گا اور سننے والوں کے لئے کوئی کشش اسکے کلام میں نہ ہوگی ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است — مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

اقبالؔ نے شعر میں اسی خلوص کی اہمیت کو اپنی مشہور نظم "شمع و شاعر" میں بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ شاعر شمع سے پوچھتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تجھ پر تو ہزاروں پروانے آکر اپنی جان نچھاور کرتے ہیں میں بھی تیری طرح اپنے جی کو جلاتا ہوں لیکن میرے گرد تو ایک متنفس بھی نہیں آتا یہ آخر تجھ میں کیا بات ہے کہ معمولی سا پتنگا بھی موسیٰ کی طرح بے قرار و بے چین ہو جاتا ہے، شمع کیا خوب جواب دیتی ہے ؎

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز — تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا!

گریہ ساماں ہیں کہ میرے دل میں ہے طوفان اشک — شبنم افشاں تو کہ بزم گل میں ہو چرچا ترا
گل بدامن ہے مری شب کے لہو سے میری صبح — ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا
یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں — تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلا ترا
اے در تابندہ اے پروردۂ آغوش موج — لذت طوفاں سے ہے نا آشنا دریا ترا

اور لذت طوفاں سے شاعر اسی وقت آشنا ہو سکتا ہے جب وہ پہلے اپنے سینہ میں دل گداختہ پیدا کرے ؂

"شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی"

یہی خلوص یہی سوز دروں اقبال کے نزدیک سب سے پہلی شرط ہے جو کسی شاعر کے دل میں ہونا چاہیئے۔ یہ خلوص یا سوز محض دکھاوے کے لئے نہ ہو بلکہ اس کی سیرت میں رچا ہوا ہو اس سوز دروں سے مراد وہ معمولی خلش یا وقتی اضطراب بھی نہیں جو عموماً نوجوانوں کے دلوں میں بہ تقاضائے سن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ میں شاعری کا بخودا موجود سمجھ کر شاعری کرنا شروع کر دیتے ہیں نہ اس سے وہ کیفیت مراد ہے جو کسی خاص واقعہ کے باعث کسی شخص پر کچھ عرصہ کے لئے طاری ہو جائے سوز دل وہ آگ ہے جو روح میں پیوست ہو جاتی ہے وہ لگن ہے جو زندگی کے عناصر میں جڑ پکڑ لیتی ہے یہاں تک کہ زندگی اسی سوز ہی سے عبارت ہو جاتی ہے انسان کا ہر قول و فعل اسی کے تابع ہو جاتا ہے لیکن یہ چیز محض خواہش سے پیدا نہیں کی جا سکتی جب تک کوئی فطرت کی طرف سے ایسا دل و دماغ نہ لایا ہو جو رنگ بو حسن نظر کے علاوہ نگہ "حقیقت نگر" بھی رکھتا ہو ؂

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ نظر سوزِ حیاتِ ابدی ہے ‏ یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں تو میں ‏ جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

ہنر میں یہ ضربِ کلیمی، اقبال کے نزدیک اپنی بہترین شکل میں اسی وقت جلوہ نما ہوتی ہے جب انسان کے دل میں وہ عشق پیدا ہو جائے جس کا مقصد بنی نوعِ انسان کی اصلاح اور ان کی شیرازہ بندی ہوتا ہے عشق کسی فردِ واحد سے بھی ہوتا ہے اور محبوب کی خدمت کرنا بھی اپنی جگہ خوب کام ہے لگن کسی خاص نصب العین سے بھی ہوتی ہے اس نصب العین کو بھی پورا کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دینا اپنی جگہ بہت مستحسن ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ ایسا عشق اور ایسا نصب العین اپنی جگہ پر خوب ضرور ہے مگر یہ محدود ہے اور اس لیے اس کا درجہ کمتر ہے خوب تر وہ لگن وہ محبت ہے جو کسی فرد کے دل میں اپنی جماعت اپنی قوم، اپنے ملک یا بنی نوع انسان سے پیدا ہو جائے اپنی ملت یا قوم یا تمام انسانوں کی تکلیفیں اس کی اپنی تکلیفیں ہو جائیں سب کا دکھ درد اس کا اپنا دکھ درد ہو جائے سب کی بھلائی اور بہتری کا خیال اس کی اپنی زندگی کا مصرف ہو جائے۔

اقبال کی شاعری محض ذاتی فشارِ غم کا نام نہیں کہ کسی شاعر نے اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑ ڈالے اور بارِ غم کو ہلکا کر لیا جی مطمئن ہو گیا نہیں اس کا دل اپنے ذاتی ہجومِ غم سے نہیں گھبراتا نہ اس کے دل پر ان سے کچھ میل آتا ہے ذاتی تکالیف تو ہر ایک کو زندگی میں کم و بیش آتی رہتی ہیں اس کے نزدیک محض ان کا ذکر کرنا انسانی عزم و ہمت کی بلندی کے منافی ہے اصل غم تو وہ ہے جو اپنی جماعت اپنی قوم یا اپنے ملک کے دکھ درد سے پیدا ہو کیونکہ اس کی اپنی زندگی جماعت

کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے وہ اپنی ملت وقوم کی ان تمام روایات اور بنیادی معتقدات کو برقرار رکھنا اس کی بقا کے لئے ضروری جانتا ہے اگر ان میں ٹھیس لگتی ہے تو سب سے پہلے اسے تکلیف ہوئی ہے اپنی جماعت کے غم میں اپنے ذاتی غم کو مدغم کر دینا شاعر کا فرض ہے انھیں خیالات کے ماتحت اقبال کے نزدیک، تو شاعر کی ہستی اپنی قوم یا اپنی سوسائٹی میں وہی درجہ رکھتی ہے جس طرح جسم میں آنکھ اور جس طرح جسم میں جہاں کہیں کوئی خرابی ہو آنکھ روتی ہے اسی طرح قوم یا سوسائٹی میں جو خرابی جب کبھی پیدا ہوگی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کا احساس شاعر کو ہوگا کیونکہ شاعر کا دل سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے اور سب سے زیادہ نرم اور پر خلوص، اسی لئے اقبال سچے شاعر کا درجہ سوسائٹی میں بہت بلند اور اس کی ہستی بہت اہم قرار دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ اگر کسی سوسائٹی یا کسی ملت میں شاعر کا وجود نہیں تو وہ ملت محض مٹی کے ڈھیر کے مانند ہے، شاعر کو سوسائٹی میں وہی مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو سینہ میں دل کو ہوتی ہے۔ افلاطون اگر آج زندہ ہوتا تو اقبال سے یقیناً اچھی جھڑپ رہتی کیونکہ وہ اپنی مفروضہ سوسائٹی میں شاعر کے وجود کو رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا مختصر یوں ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعر کو ایک بہترین انسان بھی ہونا چاہیے اگر کوئی شاعر انسان نہیں ہے تو اس کی شاعری جھوٹی اور وقتی ہے، ظاہر ہے کہ اقبال کا یہ تصور کہ شاعر کو ایک بہترین انسان اور ایک مصلح بھی ہونا چاہیے بہت وسیع اور بہت بلند ہے۔

ہمارے شعراء کا کثیر طبقہ ان شرائط کے ساتھ غالباً شاعر بننے سے گھبرائے گا

وہ شاید یہی کہیں کہ اس دنیا میں انھیں اپنے درد سے تو فرصت نہیں ملتی اور پھر اس پر قوم کا درد اپنے سر کیونکر لیا جائے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ شرط انسانیت بھی غالباً ان تمام شعراء کے لئے بہت کڑی ہے جو شاعری اور رند مزاجی کو ہم معنی سمجھتے رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا یہ وسیع اور ترقی پسند نظریہ ہمارے ان شعراء کے لئے مشعلِ راہ ضرور ہے جن کی نظریں محض حسن کی عارضی چمک دمک پر جم کر رہ جاتی ہیں اور ان حقائق تک نہیں پہنچتیں جس پر اس حسن کی بنیاد قائم ہے۔

اقبال کا عقیدہ ہے کہ شاعر کا کام آدمی کو انسان بنانا ہے اور یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسانیت تہذیب اور شائستگی کے اعلیٰ معیاروں سے وہ شاعر بخوبی واقف ہو ان پر عمل پیرا ہو تاکہ اپنے کردار و گفتار میں وہ انسان گری کے بہترین نمونے پیش کر سکے سب کو معلوم ہے کہ یہ کام رشیوں، نبیوں، ہادیوں اور پیغمبروں کا ہوا کرتا ہے اقبال کا کہنا ہے کہ ہاں شاعری بھی پیغمبری کا ایک جزو ہے اسکا کام بھی پیغمبر کی طرح قوم کو سنوارنا ہے سے

شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن — خیزد از سینائے او انوارِ حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر — فطرت از افسونِ او محبوب تر
حسن خلاقِ بہار آرزوست — جلوہ اش پروردگار آرزوست

فطرتِ شاعر سراپا جستجوست — خالق و پروردگار آرزوست
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل — ملتے بے شاعرے انبارِ گل
سوز و مستی نقش بند عالمے ست — شاعری بے سوز و مستی ماتمے ست

(اقبال)

"دگر دانائے راز آید کہ ناید"

چمن میں کسی دیدہ ور کا پیدا ہو جانا، خواہ وہ ہزاروں سال کے بعد اور بڑی
مشکل ہی سے کیوں نہ ہو چمن والوں کی خوش قسمتی ہی ہوا کرتی ہے غالباً آسمان
کی گردش کا مقصد ہی ایک مرکز پیدا کر لینا ہے۔ ہیولیٰ تھک کر سیاروں کی شکل اختیار
کر لیتا ہے تخریب بھی تنگ آکر تعمیر کا ایک بہانہ ڈھونڈھ لیا کرتی ہے اور در وحدت
بڑھ کر دوا ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے غالباً کائنات کی بقا کا راز ہی تعمیر کی
اس پر مجبوری میں مضمر ہے۔ میر کا ایک شعر ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اقبال بھی ایک ایسا ہی انسان تھا جو برسوں کے بعد خاک کے پردے سے
آج کل کی گمان آباد ہستی میں یقینِ محکم پیدا کرانے کا پیغام دے کر بھیجا گیا آجکل کی

بدلتی دنیا میں جبکہ ہر عقیدہ اور ایمان اضافی ہو رہا ہے، جبکہ تصورات اور عقائد اس قدر سرعت سے بدل رہے ہیں کہ بے ایمانی ایمان بن کر رہ گئی ہے، ذہن و فکر کے ایسے خلفشار میں ایک مستقل قندیل رہبانی کی اشد ضرورت تھی۔

اقبال کس بھید سے واقف تھا، کس امر کا رازداں تھا جو اسے رخصت ہوتے وقت بھی نہ بھولا، یہ خودی کا سرّ نہاں تھا جس کا سلسلہ اسی نعرۂ لااللہ سے ہے جو صدیوں پہلے حجاز میں بلند کیا گیا تھا آج کل کے پیمانوں کے مطابق پھر ضرورت تھی کہ اسی شراب کہنہ کو نئے ساغروں میں پیش کیا جائے کیونکہ وہ قوم جس سے دنیا کی امامت کا کام لیا جانے والا تھا اصنامِ خیالی کی پرستش میں مبتلا ہو گئی ہے۔

اس قوم کی قوتِ فکر و عمل کیوں عرصہ سے مفلوج ہے، اقبال سے پہلے بھی اسلامی مفکرین نے اس عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی، جمال الدین افغانی کے نزدیک عدم مرکزیت اکبر کے نزدیک مذہب سے انحراف اور حالی کے خیال میں تنگ خیالی اور جہالت اس گم کردہ راہ قوم کی بنیادی خرابیاں تھیں، لیکن اقبال نے ذرا اور عمیق نظر ڈالی، اس کے نزدیک مسلمانوں کے ذہنی اور عملی تعطل کا بنیادی سبب ان کا وہ غیر اسلامی ایمان ہے جسے وحدت الوجود کا عقیدہ کہا جاتا ہے اس کے نزدیک یہی اصل خرابی ہے جس نے مسلمانوں کی فکر کو مجہول اور ناکارہ بنا دیا عہد عباسیہ سے لیکر اواخر عہد مغلیہ تک یہی گھن تھا جس نے ان کے علم و عمل کی جڑیں کھوکھلی کر دیں وحدت وجود کا جذبہ برائے شعر گفتن تو خوب ہے لیکن اس کو فلسفۂ زندگی بنا لینا یقیناً فرد اور جماعت دونوں کے فکر و عمل کی قوتوں کو سلب کر لیتا ہے اقبال نے اسی کے مضر اثرات دور کرنے کے لئے "خودی" کی بلندی کا فلسفہ پیش کیا۔

خودی سے مراد غرور اور نخوت نہیں جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کا مطلب اقبال کے نزدیک اپنے نفس یا ذات کو جاننا اور اس کی قوتوں کو پہچاننا ہے خدا کی قوتوں کا نصب العین سامنے رکھتے ہوئے اگر اپنی ذاتی قوتوں کی نشوونما کی جائے اور اس راستہ پر مسلسل عمل کیا جائے تو انسان کی خودی بھی اس قدر پائدار اور لازوال ہو جاتی ہے کہ ؎

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اور آخر نیابت الٰہی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے ؎

نائب حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر حکمراں بودن خوش است

یہی وہ راز تھا جسے علامہ اقبال نے جانا اور جسے مختلف طریقوں سے رنگین کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا، ان کا خیال ہے کہ خودی کی تہذیب اور تربیت اگر عشق، عمل، فقر اور ضبط نفس سے کی جائے تو ہر قسم کے ذہنی اور اخلاقی نقائص دور ہو سکتے ہیں، ان کا یہ پیام کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ ہر قوم کے لیے ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خودی کی اس قدر بلندی کے لئے اس کو آزادی کی ضرورت ہے یعنی ایک ایسے معاشرے کی جس میں فضول کے ذہنی قیود اور پابندیاں نہ ہوں اور یہ آزادی اس کو ملت اسلامیہ ہی میں سب سے زیادہ نصیب ہو سکتی ہے جہاں نسل قومیت، کلیسا، تہذیب اور رنگ کی خیالی زنجیریں وہاں نہیں ہیں۔ لیکن ملت اسلامیہ کی حالت خود ابتر ہے، اس کے دفتر کے اجزا خود پریشان ہیں اس لئے اقبال ان اوراق کی شیرازہ بندی بھی کرنا چاہتا ہے، وہ جانتا ہے کہ مسلمانوں کا لہو سرد ہو گیا ہے، ان کے ہنگامے ہائے آرزو سرد ہو گئے ہیں، وہ تقدیر

کی گداگری کرتے ہیں خود اپنی تقدیر کے یزداں نہیں ہیں، نفی خودی کے سبق نے ان کے بازو شل کر دیے ہیں، ان میں وہ حرارت باقی نہیں رہی جو شعلۂ جاں کو مشتعل رکھتی تھی مرکزیت ان میں نہیں رہی، اخوت اور محبت ان سے مفقود ہے نسل، خاندان، قبیلہ، ملک وصوبہ کے امتیازات ان کے ذہنوں پر بھیسر مستولی ہو گئے ہیں مغرب کی کورانہ تقلید میں وہ کسی سے پیچھے نہیں، ہوس نے چھپ چھپ کر ان کے سینوں میں تصویریں بنالی ہیں، نہ ان میں یقین محکم رہا، نہ عمل پیہم نہ وہ محبت ہے جو فاتح عالم ہوا کرتی ہے لیکن اقبال حالی کی طرح ناامید نہیں ہوتے وہ سمجھتے ہیں کہ اس قوم میں بیداری ضرور پیدا ہوگی اور اس کی بیداری ایسی ہوگی کہ یہ قوم دوسرے سوتے ہوؤں کو بھی جگا دے گی، یہ چنگاری ایسی بھڑکے گی کہ دوسروں کے لیے مشعل ہدایت کا کام دے گی ضرورت محض اس راکھ کے ڈھیر کو ہٹا دینے کی ہے جس کے نیچے یہ چنگاری دبی پڑی ہے اقبال امت کی اس آخری خوش اقبالی کے راز سے واقف ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس قوم کو اپنا بھولا ہوا سبق پھر یاد آجائے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ترے سینہ میں پوشیدہ ہے رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

اور وہ حدیثِ زندگی کیا ہے؟

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی! — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں فانی، ازل تیرا ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

یہ نکتہ سرگزشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مسلمان آج کل ہر جگہ یا تو کمزور ہیں یا غلام ہیں، غلامی کی زنجیریں کس طرح کٹ سکتی ہیں، یہ کمزوری کس طرح دور ہوسکتی ہے۔ محض اسی یقین کامل، اسی محکم ایمان سے جو کبھی اس کا خاص سرمایہ تھا اور جس سے اب وہ تہی دست ہے ۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے
دلِ گرمے نگاہے پاک بینے جانِ بیتابے

یہ تھا وہ راز جسے اقبال مرحوم بتا کر اور سوتی قوم کو جھنجھوڑ کر ہم سے رخصت ہو گئے لیکن اب اس قوم کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ کیا ان کے پیغام کی تکمیل کرانے کے لئے کسی دوسرے دانائے راز کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس قسم کے سوالات لامحالہ ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جس قوم میں اپنی حالت سنوارنے کا احساس اور ذوق ہوتا ہے یقیناً اس میں تو ایسے ہادیوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، لیکن بظاہر نہ خود ملّتِ اسلامیہ میں اس کا احساس ہے نہ دنیا کی کوئی اور قوم ایسے تعمیری کی طرف گامزن نظر آتی ہے جو فکر و نظر کی رہبری کرے اور قلوب میں وہ یقین کامل پیدا کر سکے جو اقبال کے نزدیک خودی

کی تربیت کے لئے اولین شرط ہے، دنیا تاراجیت کی طرف رواں دواں ہے اور فی الحال کوئی آثار ایسے نہیں دکھائی دیتے جن سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ ابلیسی کارفرمائیاں کمزور پڑ رہی ہیں، شرار مصطفوی کو اس ستیزہ کاری میں اپنی برتری اور اپنا زور خودی دکھانا ضروری ہے، حق اور حقانیت کی آخری فتح لازمی ہے اس میں شک نہیں کہ اقبال نے مرض کی تشخیص بڑی حد تک صحیح کی، فنا فی اللہ کے بجائے بقا الی اللہ کا درس یقیناً عروق مردہ مشرق میں خونِ زندگی کی حرارت اور گرمی پہونچانے والا ہے، لیکن علامہ اقبال نے یہ راستہ اس مسافر کیلئے تجویز کیا تھا جو اپنی منزل تو جانتا ہے لیکن گم کردہ راہ ہے، یہ علاج اس مریض کے لئے مناسب اور صحیح ضرور ہے جس کا جسم تو بیمار ہو لیکن دل میں ناسور نہ ہو، بڑی دقت تو یہ ہے کہ آج دلوں میں ناسور ہیں دلوں میں چور ہے، ہم اپنی منزل ہی بھول گئے ہیں خودی کی تکمیل کیسے ہو جبکہ خدا کا نصب العین ہی ذہنوں کے سامنے دھندلا پڑ گیا ہو، مادہ پرستی کی ممارست نے قلوب پر اصنام خیالی کے ایسے پرتو ڈال دیئے ہیں کہ ذہن اوہام میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے اور نظر ماسوا اللہ میں جا الجھی ہے اسلئے اشد ضرورت اب بھی اسکی باقی رہتی ہے کہ اس نور یزدانی کی چمک دمک قلوب کے سامنے مسلسل پیش کی جائے اور مزید تابانی کے ساتھ جب تک وہ منزل سامنے نہ رہے گی ایمان اور یقین میں وہ پختگی نہیں آئے گی۔ خودی کے راستہ میں قدم تو ڈالے جاسکتے ہیں لیکن قدم ڈگمگاتے رہیں گے جبتک وہ مشعل ہدایت روبرو نہ ہو۔ علامہ نے اس کے متعلق بھی کافی فرمایا ہے۔ مثلاً ؎

لَا اِلٰہ سرمایۂ اسرار ما — رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

تا نہ رمز لَا اِلٰہ آید بدست — بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

ہر کہ اندر دست او شمشیر لاست | جملہ موجودات را فرماں رواست

لیکن اسکے لئے کوئی اور تیز چیز ہونا چاہیئے ضرورت تکرار کی ہے، تاکہ آج وہ آتش اللہ ہو جو سرد ہو چکی ہے پھر مشتعل ہو سکے، اور دماغوں میں جو بت خانے قائم ہو گئے ہیں پھر منہدم ہو سکیں اور مسلمانوں کی سیرت میں قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کے عناصر پیدا ہو سکیں جن کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ محض خون میں گرمی اور حرارت پیدا کر دینا اور خودی کے بہاؤ کا راستہ بتلا دینا ہی پوری کارروائی نہیں ہے، ضرورت اس امر کی باقی رہ گئی کہ وہ مفقود بطور راہبر اس مسافر کے ساتھ تھوڑی دور چلے بھی، راستہ جو انھوں نے مسلمان کو بتایا وہ اب اس کے لئے نیا سا ہے، وہ بھول چکا ہے کہ اس راہ میں کتنے پیچ و خم آتے ہیں اس لئے رہنما کو کچھ دور اور رہنمائی ضروری تھی، لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہ محرم راز درونِ میخانہ، ہم رندوں سے چھن گیا۔ اب چاہیئے تو یہی کہ قوم اس کے بتائے ہوئے رخ پر چلے کیونکہ صحیح راستہ اسی طرف ہے لیکن اگر نہ چلی تو قدرت کے قوانین پھر کسی دانائے راز کو اقبالؔ کی اس تعلیم پر عمل کرانے کے لئے ضرور بھیجیں گے اس کردار کے غازی کی سیرت کی تعمیر میں اس گفتار کے غازی کی تعلیم کا کس قدر حصہ ہو گا، غالباً اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ اقبالؔ خود بھی اس کے آنے کا احتمال رکھتے تھے اسی لئے فرما گئے ہیں ؎

اگر آید دگر دانائے رازے | بدہ او را نوائے دلگدازے
ضمیر امتاں را پاک سازد | حکیمے یا کلیمے کے نوازے

موجودہ غزل کا ترنّم

شاعری اگر بقول جانسن مترنم خیالات کا اظہار ہے تو غزل سے بہتر کوئی ہیئت اس شعری جذبہ کے اظہار کی کہیں بھی دنیا میں غزل سے بہتر ایجاد نہیں ہوئی۔ اور ممکن بھی نہ تھی۔ کیونکہ قوافی کی کثرت جتنی ہماری زبانوں میں ہے کسی زبان میں نہیں ہے مصرعوں میں بحر کی یکسانی قافیوں کی تکرار، آخر میں ردیف کی وجہ سے صوتی ہم آہنگی یہ سب مل کر غزل کی ساخت میں خود ہی تال، سر، نغمہ اور آہنگ کی ایک خوش آیند سے پیدا کر دیتے ہیں ایسی شعر نوازی پھر کسی ساز یا کسی گویئے کے راگ کی محتاج نہیں رہتی دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعرانہ ہیئتوں کو لے لیجئے تقریباً سب ہی کسی نہ کسی ساز یا کسی نہ کسی راگ کے سہارے چلتی نظر آئیں گی لیکن ہماری غزل اپنی ساخت کے اعتبار سے خود ہی ایسی چیز ہے جو آدمی کو مترنم بنانے گانے یا گنگنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ محض اس کا پڑھنا

ہی نغمہ نوازی پر مائل کر دینے کے لئے کافی ہے غزل کی بہت بڑی خوبی اور بہت بڑی خصوصیت یہی ہے۔

اور پھر باعتبار لغت بھی غزل محبوب سے میٹھی میٹھی لگاوٹ کی باتیں کرنے کا نام ہے۔ اس بھری باتوں میں شیرینی اور ترنم کیونکر نہ ہوگا۔ اور راز و نیاز کی گفتگو میں مٹھاس کیوں کر نہ ملی ہوگی جس صنف شاعری میں شعر اور نغمے کی اس قدر یکجائی ہو، اسے شعراء کی خلوت آرائی کے علاوہ ارباب نشاط کی جلوت آرائی میں ظاہر ہے کیا کچھ دخل نہ ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ ہندی کی طرح اردو کے الفاظ آسانی سے توڑے مروڑے نہیں جا سکتے اس لئے اردو غزل ہندی راگوں اور راگنیوں کا ساتھ کامیابی سے نہیں دے سکتی لیکن دوال اور سادہ تالوں کے ساتھ خوب ہم آہنگ ہو جاتی ہے اسی لئے قوالیوں کی محفلوں اور لطف و نشاط کی مجلسوں میں اس نے شروع ہی سے بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اسی لئے شاہوں اور امیروں کے دربار ہوں یا صوفیوں کی خانقاہیں دونوں جگہیں اس کے نغموں سے معمور رہی ہیں اصل میں غزل کی مقبولیت بہت کچھ انھیں قوالی کی مجلسوں اور رقص و سرود کی محفلوں کی رہین منت ہے۔

لیکن غزل کا یہ بزم آرا مزاج محض سامعہ نوازی کرتا رہا ہے اس کا ترنم روح کی گہرائیوں تک نہ اتر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیشتر اس کے ظاہری نصاب پر زور دیا جاتا رہا۔ غالب کے زمانہ تک بلکہ ان کے بعد تک قافیہ پیمائی رعایت لفظی کی کاوش سنگلاخ زمینوں کا اختیار کرنا، مشکل ردیف اور قوافی کا برتنا عام رہا ہے شاعروں میں مقابلے بھی اسی نیت سے ہوتے رہے کہ کس شاعر نے

کس زمین کے مشکل ردیف اور قوافی میں غزل کو سر انجام دیا۔ انشاؔ اور مصحفیؔ کے معرکوں اور شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کے مقابلوں ناسخؔ اور آتشؔ کی معاصرانہ چوٹوں کا حال سب کو معلوم ہے اس کا مقصد محض قادر الکلامی دکھانا ہوتا تھا یا غزل میں صرف زبان اور بیان کی خوبیاں پیدا کرنا شاعری صرف موزوں طبع لوگوں کی جاگیر تھی نہ کہ ان لوگوں کی جن کی روحیں مترنم ہوتی ہیں یہ روح کا مترنم ہونا محض شاعرانہ بات نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنے افتاد مزاج کے مطابق ایک داخلی ترنم اپنی روح کے اندر رکھتا ہے وہ ترنم چاہے میرؔ کی طرح مدھم اور نازک سردوں والا ہو یا غالبؔ کے انداز کا بہت شگفتہ یا داغؔ کی طرح بہت شوخ یا انشاؔ اور جرأتؔ کے طرز کا بہت رنگین یا پھر اقبالؔ کی طرح بہت بلند آہنگ ہو لیکن ہر بڑے شاعر کے یہاں اس کا اپنا انداز ترنم ہونا ضروری ہے۔ مگر یہ داخلی ترنم کسی شاعر کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کا دل حساس یا زخم خوردہ نہ ہو، عموماً یہ روح کا نغمہ شکست سازہی سے پیدا ہوتا ہے مطلب یہ کہ شاعر کا موزوں طبع یا ماہر فن ہونا کام نہیں دیتا جب تک اس کے اندر گہرے یا پرجوش تاثرات اور احساسات نہ ہوں، ایسا شاعر جب فنی تجربے کرتا ہے تو وہ جان دار بھی ہوتے ہیں۔

غالبؔ کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟ صرف یہی کہ انھوں نے فنی کمال کے ساتھ موزوں الفاظ کی ترتیب اور متناسب بحروں کا انتخاب خیال و معنی کی رعایت سے رکھا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں معنی اور صورت جسم و جان کے تناسب کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے بعد عرصہ تک غزل میں ہم کو وہ نغمہ اور چھپا ہوا وہ آہنگ نہیں ملتا

غالب کی غزلوں کی جان ہے۔ غزل جوں کی توں چلتی رہی، شاعروں میں مقابلے ہوتے رہے۔ دیوان لکھے جاتے رہے، فرمائش پہ غزلیں کہی جاتی رہیں لیکن کسی نے کوئی خاص جدت نہ دکھائی خود حالی اپنے اصولوں کو اپنی غزلوں میں برتا کئے لیکن ان کی غزلیں باوجود اصلاحی ہونے کے پھیکی رہیں کیونکہ ان کی طبیعت میں رچا ہوا تغزل نہ تھا شاعری کی روح میں جب تک جذبات کی ہماہمی یا اتار چڑھاؤ نہ ہو تب تک شعر میں گرمی پیدا نہیں ہوتی۔

عہد غالب کے بعد رام پور کا دربار دیکھئے، نواب سعادت علی خاں اور نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں غزل کے بڑے بڑے استاد تقریباً ہندوستان کے ہر کونے سے آکر وہاں جمع ہو گئے تھے ارباب شوق کا بھی مجمع تھا بعض استاد فن تو خاص راگ راگنیوں میں اپنی اپنی غزلیں کہہ کر گرمیٔ محفل کے لئے ارباب نشاط کو دیتے تھے لیکن اس کے باوجود داغ کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا اس کی وجہ یہی ہے کہ داغ جو کچھ اور جیسا کچھ محسوس کرتے تھے اسے شدت سے محسوس کرتے تھے اور بلا جھجک پیش کرتے تھے ان کا سوز ساز بنکر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا تھا داغ کی غزلیں آج بھی کس قدر سامعہ نواز ہیں۔ ے

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں! ناز والے نیاز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھئے میکشوں سے لطف شراب یہ مزہ پاک باز کیا جانیں
پیامی کامیاب آئے نہ آئے خدا جانے جواب آئے نہ آئے
ناروا کہیے ناسزا کہیے کہیے کہیے مجھے برا کہیے

زبان عام روزمرہ کی ہے، قافیہ اور ردیف بہت سادہ اور آسان ہے بحر ترنم ادر پھر ساتھ ہی پس منظر میں بھی عاشق مزاجی کی وارداتیں ہیں، اثر کیوں کر نہ ہوتا اور ان کی یہ غزلیں عوام میں کیونکر مقبول نہ ہوتیں۔

داغ کے بعد کامیاب غزل گویوں میں ہماری نظر حسرت پر پڑتی ہے باوجود اسکے کہ وہ اپنی راہ بہت دیر میں پہچان سکے اور اس پر بھی زیادہ نہ چل سکے لیکن یہاں کہیں اپنی طبیعت کو دخل دیا انکی غزلوں میں مضمون مسلسل پیدا ہو گیا ہے غزل مسلسل ہر معنی کی یکسائی جذبے کے لحاظ سے انتخاب الفاظ میں بڑی مدد دیتی ہے اور انتخاب الفاظ کا گرہی غزل میں ترنم پیدا کرنے کا گر ہے حسرت کی یہ غزل دیکھئے کس قدر رواں ہے ؎

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جایئے

بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے

اب نہ پھر ملئے کبھی اور بے وفا ہو جایئے

گر نگاہ شوق کو محو تماشا دیکھئے

قہر کی نظروں سے مصروف سزا ہو جایئے

حسرت کی یہ غزل مسلسل بھی خوب ہے جس کا مطلع ہے۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ۔ ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

ان کی غیر مسلسل غزلوں میں بھی یہ غزلیں شاید صاحب دل حضرات کبھی فراموش نہ کر سکیں جن کے مطلعے ہیں:۔

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے ۔ وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

لیکن داغ اور حسرت باوجود اس کے کہ "ادائے شاعری چیزے دگر است" کے قائل تھے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مشاعروں اور فرمائشوں اور دیوان سازی کے چکر سے نہ نکل سکے انھیں بیشتر غزلیں اپنی طبیعت سے ہٹ کر کہنی پڑیں اور غزل کی تمام شاعری میں اگر جذبہ کی صداقت نہ ہو تو اس کا اثر یا تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو دیرپا نہیں ہوتا ترنم کے التزام کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ جذبہ کے موافق لائے جائیں کلام حال کے مطابق ہو ایسا جب کبھی ہوگا تو مصرع یا شعر خود بول اٹھے گا اور بولتے ہوئے شعر اس وقت تک سرزد نہیں ہوتے جب تک شاعر خود صاحب حال نہ ہو ایسا شاعر جب کبھی کوئی جدت بھی اپنے انداز بیان میں پیدا کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے اقبال کے کلام کا ترنم کیوں بڑھ جاتا ہے؟ اس لئے کہ انھوں نے الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب بڑے سلیقے سے کی ہے مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؎

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

پہلے مصرع کے الفاظ کی ترتیب کو بدل دیجئے، کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے کرم کے ہیں منتظر مصرع اپنی جگہ پر موزوں ہے لیکن ترتیب کی خرابی سے ترنم کا نام و نشان نہ رہا — the last words read: ترنم کی وہ خوبی

باقی نہیں رہی۔ لیکن الفاظ کے اس سلیقۂ انتخاب کے کوئی اصول و قواعد نہیں بنائے جا سکتے ہیں یہ مذاق سلیم پر منحصر ہوتا ہے الفاظ اور بحروں کا یہی سلیقۂ انتخاب تھا جس نے ان کی نظموں اور غزلوں میں بلند آہنگی پیدا کر دی ان کے اسلوب کی چند مثالیں سنئے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

دل ہر ذرہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی

رہی دیرینہ بیماری رہی نامحکمی دل کی!

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

اقبال اکثر ردیف کو اڑا بھی جاتے ہیں اور قافیہ پر ہی اپنی لے کی تان توڑتے ہیں اس سے ایک باوقار ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے یا ایک طرح کی قطعیت۔

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی

کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے ہماری شاعری میں ایک نیا باب کھولا ہے ماسوا اسکے

کہ ان کا پیام کیا ہے، یا ان کا مقصد شاعری کیا ہے، ان کے بلند آہنگ نغموں نے ہماری شاعری میں ایک نیا راستہ دکھایا ہے اور آج کل کے بہت سے نوجوان شعرا اس رستے پر گامزن نظر آتے ہیں لیکن کوئی کلام اس وقت تک نہ پیدا ہوگی جبتک ان کی جیسی گرمی روح بھی اپنے اندر نہ پیدا کرلیں یہ ان کے سوز دروں ہی کی بدولت ہے کہ ان کی غزلیں بیشتر مسلسل مضمون کی حامل ہوتی ہیں۔ غزل میں مضمون مسلسل نہ ہو تو بھی لازم ہے کہ پوری غزل میں ایک ہی سرور اور ایک ہی جذبہ پیش کیا جائے۔ یہ انفعالی وحدانیت غزل کو ایک رچا ہوا اثر تم بخش دیتی ہے جوش کے یہاں آپ کو اس کی مثالیں زیادہ واضح اور پرکیف ملیں گی۔ اس لئے کہ جوش کا موضوع اصل میں تغزل ہی ہے حالانکہ اب وہ اپنی غزلیات مسلسل کو نظم کہنا پسند کرتے ہیں لیکن دراصل وہ نظمیں نہیں ہوتیں۔ جوش نغمہ و شباب کے شاعر ہیں اپنے انتہائی کمال پر ان کا فن اس وقت ہوتا ہے جب وہ تغزل کے موضوع باندھتے ہیں

یہ غزل مسلسل سنیئے :-

شب کہ حریم ناز میں شورِ صد اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر حسن بھی بے نقاب تھا

موج ہوا میں عطر تھا چھٹکی ہوئی تھی چاندنی
پھول کھلے تھے باغ میں چرخ پہ ماہتاب تھا

دل کی رگوں میں عشق کی دوڑ رہی تھیں بجلیاں
حسن کے دست ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا الخ

یا

لے لیا دل اک ہوش ربا نے کانِ شوخی، جانِ حیا نے
آفتِ جاں نے، فتنۂ شہر نے جانِ جہاں نے، روحِ رواں نے
موجِ تبسم دامنِ لب پر برق کی رَو، بجلی کے خزانے
وقتِ خرامِ ناز، جلو میں صبحِ چمن کے تازہ ترانے

حسین الفاظ، مترنم الفاظ، رنگین الفاظ اور پھر اس کے ساتھ موضوعِ تغزل غزل اپنی معراج پر کیوں نہ نظر آئے جوشؔ کی غزلوں کی یہی شان ہے کہ جوشِ شباب کے باعث جگہ جگہ نغمہ پھوٹا پڑتا ہے حقیقت بھی یوں ہے کہ جہاں حسن بیتابِ تماشا ہو اور عشق باریاب ہو وہاں ترنم اور نغمے کی کیا کمی ہو گی۔

اقبالؔ کی پیغمبری اور جوشؔ کی ساحری کے بعد دو صاحبِ دل شاعروں کا رنگ تغزل دیکھئے۔

اصغرؔ ایک صاحبِ دل شاعر تھے ان کے کلام میں بھی ایک ہلکی سی لیکن سرمست سی انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے ان کے یہ اشعار پڑھئے تو ان میں موسیقی خود گنگناتی نظر آئے گی۔

رخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
مری اک بیخودی میں سیکڑوں ہوش و خرد گم ہیں
یہاں کے ذرے ذرے میں ہے اک وسعت بیاباں کی

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا
روداد قفس سنتا ہوں اس طرح قفس میں جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

ترے جلوؤں کے آگے ہمت شرح بیاں رکھ دی

زبان بے نگہ رکھ دی نگاہ بے زباں رکھ دی

نیاز عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظ ناداں

ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی

جگر کے یہاں بجائے جوش کے سرمستی ہے انھیں فراق اور وصال سے اتنی غرض نہیں جتنی اپنی بے خودی سے اسی گونہ بیخودی میں انھیں دونوں جہان کی نعمتیں میسر ہیں اور اسی جذبے مسلسل کے باعث ان کی غزل میں بلا کی سرود کی کیفیت پائی جاتی ہے جو اپنے پرکیف ترنم سے دلوں کو موہ لیتی رہی ہے۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

کبھی حسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ

وہی ناز بے نیازی وہی شان خسروانہ

ان کے بیان عشق و حسن اور حدیث رندانہ کا رنگ یہ ہے

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا

دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسن تصور کا فریب رنگ و بو

میں یہ سمجھا جیسے وہ جان بہار آ ہی گیا

غزل کے ترنم کی جہاں گفتگو ہو وہاں فراق گورکھپوری کو کون بھول سکتا ہے غزل کو نکھارنے اور اسے طرح طرح سے مترنم بنانے کے لئے جیسے وہ نئے نئے تجربے کر رہے ہیں

اتنے شاید کبھی لے نہیں گئے بظاہر غزل کو مترنم بنانے کے لیے یہی کیا جا سکتا ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور ان کی ترتیب اور ان کی بندش یا بحروں کے انتخاب میں سلیقہ دکھایا جائے یا پھر ردیف کو ترک کر دیا جائے یا غزل کو مستزاد بنایا جائے لیکن فراق نے ایک جدت اور کی ہے۔ انھوں نے محض ترنم کی خاطر ہندی کے لہجے اور ہندی عروض کو اردو میں صرف کرنے کی بڑی خوبصورت کوشش کی ہے دیکھئے اس غزل کو گیت کیونکر بنایا ہے۔

آنکھوں سے چھلکے شراب رے ساقی آنکھوں سے چھلکے شراب

آنکھوں سے چھلکے شراب، جادو کیف مست حباب

جادو کیف شراب رے ساقی، جادو کیف شراب

جلوہ شیشہ و جام چھاچھم، موج مے گلفام چھاچھم قامت ساقی برق دمادم

ان کا کہاں جواب!

ان کا کہاں جواب رے ساقی، جادو کیف شراب

فراق ترنم کے رسیا ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ الفاظ جن میں حروف ل م ن ر کی کثرت ہو وہ کیا موسیقی پیدا کر سکتے ہیں بعض اوقات تو محض ترنم کی خاطر وہ متروک الفاظ سے اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ یہ غزل دیکھئے:-

رات دن پلکوں تلے اشکوں کی لڑیاں دیکھیاں

جو دکھایا تیری فرقت نے وہ گھڑیاں دیکھیاں

دل دھڑکے لہرا کے سینوں سے دھواں اٹھنے لگا

آگ برساتی ہوئی ساون کی گھڑیاں دیکھیاں

آخر میں اتنا عرض کر دینا اور چاہتا ہوں کہ ترنّم کے سلسلے میں ابھی قافیے کی صورتوں میں تجربہ کرنے کی بڑی گنجائش ہے، اس طرف ابھی ہمارے شعراء نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے میں قافیہ کے ترک کرنے کے بالکل خلاف ہوں کیوں کہ ہمارے یہاں اس کی ضرورت نہیں بعض حضرات صنف غزل کو ہی اڑا دینا چاہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ غزل کو اپنے ترنّم کے باعث قبول تمام کا درجہ حاصل ہے اور جب تک آپ اسے ہندوستانی شاعری میں برقرار رکھیں گے آپ دیکھیں گے کہ شعر اور نغمہ کے بازار میں اردو زبان کا سکّہ خوب چلتا رہے گا۔

مہدی افادی

اگر موت کی سفاکیاں اتنی تمام نہ ہوتیں جتنی کہ ہیں تو یقیناً آج دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی اسی موت کے ہاتھوں نہیں معلوم کتنی حسین اور مہکنے والی کلیاں تھیں جو بن کھلے مرجھا گئیں اور نہیں معلوم کتنے بار آور درخت تھے جو پھل پھول لانے سے پہلے ہی خشک ہو گئے ے

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض ہستیاں اپنی ذہنی صلاحیتوں کی کچھ چمک دمک دکھانا شروع ہی کرتی ہیں کہ ان کا شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے ایسی شخصیتوں میں ایک بزرگ کا نام مہدی حسن تھا جن کی قبل از وقت موت اردو ادب میں ایک سانحہ تصور کی جاتی ہے۔

مہدی حسن کا وطن گورکھپور تھا۔ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و

فارسی کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی انگریزی تعلیم پہلے مقامی اسکول میں، اور پھر علیگڈھ سے حاصل کی زندگی کی ایک بہت بڑی ٹریجڈی یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی جس کام کے لئے موزوں نہ ہو حصول معاش کی خاطر اسے اس میں سر کھپانا پڑے۔ چنانچہ مہدی حسن کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ قسمت نے اس ادب اور ادیبوں کے دلدادہ، نفاست اور پاکیزگی کے پرستار کو بنایا تو کیا تحصیلدار! جسے خسرہ، کھیوٹ اور کھتونی اور تحصیل وصول کی الجھنوں سے فرصت ملتی ہے تو حکام ضلع کی درباداری یا تحصیل کے دیگر نہایت غیر شاعرانہ کاموں میں مشغول رہنا پڑتا ہے لیکن مہدی افادی کا ادبی ذوق و شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ باوجود اپنی ان خشک مصروفیات کے وہ پڑھنے لکھنے کیلئے روزانہ کچھ نہ کچھ وقت نکال لیتے تھے اعلیٰ معیار کی کتابوں کا اس قدر شوق تھا کہ ان کی تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ کتابوں کی خریداری میں صرف ہو جاتا تھا پھر یہی نہیں، کتابوں کی جلدیں بھی نفیس ہونی چاہئیں اور ان کو محفوظ رکھنے کے لئے الماریاں بھی خوشنما ہوں پتہ لگتا کہ کوئی اچھی کتاب چھپ کر آنے والی ہے تو کتب فروش کے وہاں ان کا آرڈر پہلے ہی پہونچ جاتا تھا۔ شبلی کی تصنیف مولانا روم چھپ کر آئی تو اس کا استقبال عروس جمیل و لباس حریر کہہ کر کیا۔

افسوس اس کا ہے کہ مہدی حسن اپنی کوئی تصنیف مکمل نہ کر سکے صرف ان کے چند متفرق مضامین اور چند خطوط کے مجموعے ہیں جو ان کی وفات کے بعد افادات مہدی اور مکاتیب مہدی کے نام سے بیگم مہدی حسن نے شائع کرائے ہیں لیکن یہ چند مضامین اور خطوط ہی ایسے ہیں کہ انھیں اردو کے ادب العالیہ یعنی کلاسکس میں جگہ دی جاتی ہے مہدی حسن کے مزاج میں بلا کی شوخی اور شگفتگی تھی اور یہی چیز ہم کو ان کے

اسلوب بیان میں بھی نظر آتی ہے۔ صاف شفاف اور رچا ہوا مذاق ہے جو ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نکھر اٹھتا ہے۔ سید ناصر علی، ایڈیٹر صلائے عام (دہلی) کو ایک کھلی چٹھی میں لکھتے ہیں۔

"میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں آپ کی چشم سخن جہاں جنس لطیف اور اس کے متعلقات کی طرف اشارے کرتی ہے وہ نزاکتِ خیال کی آخری حد ہے ...... یورپ میں جو آج بڑے پائے کے لکھنے والے ہیں ان میں مذاق حسن پرستی اس قدر رچ گیا ہے کہ قریب قریب ان کی ہستی کا ایک جزو ہو رہا ہے عورت، جسے خواب طفلی اور آرزوئے شباب کہئے ؎

ہر بات تری فسانۂ حسن۔

ہیئت اجتماعی یعنی سوسائٹی کی روح رواں ہو رہی ہے جس سے کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ؎

عکس رخ موتیوں کے دانوں میں

صنفِ نازک آپ کے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آ ہی جاتی ہے۔"

سید ناصر علی کے متعلق مہدی حسن کی یہ رائے خود ان کی تحریروں پر بھی خوب صاد آتی ہے یعنی کوئی موضوع ہو صنف نازک ان کے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے ضرور آ جاتی ہے خاص کر جب وہ اپنی عبارت کو رنگین اور پر شباب بنانا چاہتے ہیں یا اپنے کسی ثقہ اور مولوی قسم کے دوست کو چھیڑنا چاہتے ہیں مثلاً مولانا شبلی

سے مہدی حسن بڑی خصوصیت رکھتے تھے اور ان کی تحریروں سے بڑی محبت اور عقیدت تھی ان کے متعلق ایک دلچسپ ٹکڑا یوں لکھا ہے :-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی گلی کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھ ملا سکتی ہے"

دیکھئے رنگیں بیانی یہاں بھی نہ چھوڑی گئی اس طرح کے لطیف اور شاعرانہ ٹکڑے افادات مہدی میں جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں ان کے بعض مضامین مثلاً خواب طفلی و آرزوئے شباب، فلسفۂ حسن و عشق، اور بنت عم، میں تو ان کا یہ مذاق حسن پرستی اس قدر شوخی کے ساتھ واضح ہوا ہے کہ تصور کے لئے گنجائشیں بہت کم رہ جاتی ہیں۔

یونانیوں کا سا ذوقِ حسن رکھنے کے علاوہ ان کی تحریر میں ایک بیباکی بھی تھی جس بات کو وہ صحیح سمجھتے اسے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ اظہار کرنے میں انھیں ذرا تامل نہ ہوتا تھا اور ایسے موقعوں پر وہ کسی کی ذرا بھی رورعایت نہ کرتے وہ چاہے کتنی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو۔

علی گڑھ کے ایک مشہور بزرگ نے شعر العجم میں کچھ خامیاں نکالیں مہدی حسن نے انھیں جس سختی سے ٹوکا اس کا اندازہ ان کے ایک مضمون شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر، پڑھکر معلوم کیا جا سکتا ہے ایک دفعہ مارہرہ کے ایک مشہور شاعر اور نقاد نے خود مہدی حسن کی عریاں نگاری پر کچھ حملے کئے ان کی خبر بھی ایسی بری طرح لی کہ پھر اسکے بعد انھیں مہدی کے خلاف کچھ لکھنے کی ہمت نہ پڑی اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ

شبلی کا موازنہ انیس و دبیر، جس وقت شائع ہو کر سامنے آیا تو اکثر لوگوں نے خواہ مخواہ اس کی مخالفت کی ایک بزرگ جو لکھنے پڑھنے کا اچھا مذاق رکھتے تھے ان سے مہدی حسن نے موازنہ کا ذکر کیا۔ سن کر چپ سے ہو گئے۔ مہدی نے فوراً کہا کہ موازنہ میں جو کچھ نقص ہے یہ ہے کہ وہ آپ کے قلم کا نتیجہ نہیں ہے اس برجستہ گرفت پر وہ صاحب پھڑک گئے اور ان کو اقرار کرنا پڑا کہ موازنہ سے اہل قلم کو جو کچھ شکایت ہو سکتی ہے وہ اسی قبیل کی ہے۔

مہدی حسن کے ادبی دوستوں کا حلقہ اچھا خاصا تھا۔ اس زمانے کے جتنے مشہور لکھنے والے تھے مثلاً حالی و شبلی سلیمان ندوی۔ ریاض خیرآبادی عبدالماجد دریاآبادی وغیرہ سب سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی اور ان کے خطوط ایسے دلچسپ ہوتے تھے کہ یہ لوگ منتظر رہتے تھے کہ کب مہدی کا خط آتا ہے۔ عام طور سے انکے خطوط میں ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی یا ادبی تنقید کا حق ادا کیا جاتا تھا۔ ایک مثال سنئے پروفیسر عبدالباری کو غالب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "جو کچھ کھاؤ غالب سے منسوب کیا جاتا ہے ان میں سے اکثر نکات بعدالوقوع ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ حکیمانہ صداقتیں ان کے کلام میں موجود نہیں سوال یہ ہے کہ جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اس کو ڈھالنا چاہتے ہیں کیا شاعر بھی ہر جگہ اس نکتہ سے واقف تھا؟ اس میں فی را مجھ کو کلام ہے"

مہدی حسن کا اردو، فارسی اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے ان کے یہاں تنقیدی نقطۂ نظر میں ہم کو مشرق اور مغرب کا سنگم ملتا ہے شروع

بیسویں صدی میں مغربی تعلیم کے زیر اثر جو نیا تنقیدی نقطۂ نظر پرورش پا رہا تھا اس کی بہت اچھی مثالیں اور اشارے ہم کو مہدی حسن کی تحریروں اور مکاتیب میں ملتے ہیں تقابلی مطالعۂ ادبیات کے باعث ان کی نظر میں وہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی تھی کہ جب وہ کوئی رائے دیتے تھے تو اس میں بڑا وزن ہوتا تھا۔ مثلاً ان کا یہی قول بہت شہرت پا چکا ہے کہ

"سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

مہدی حسن کی رایوں سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں لیکن آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی رایوں میں ایسی قطعیت ہوتی تھی جو گہرے اور وسیع مطالعہ ادب کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے اور پھر آپ یہ بھی ذہن میں رکھیے کہ شروع بیسویں صدی میں ایسی بے لاگ اور دو ٹوک تنقید پیش کرنا معمولی لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک حقیقی تنقید نگار محض خوبیاں بتانے اور نقائص نکالنے ہی کا کام نہیں کرتا بلکہ ایک تعمیری پروگرام بھی رکھتا ہے مہدی حسن کی ایک تجویز تھی کہ اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ یعنی سرسید، آزاد، نذیر احمد، شبلی اور حالی پر اچھی تنقیدیں پیش کی جائیں ان کے الفاظ میں۔

"میری خواہش یہ ہے کہ آج کل کے اچھے لکھنے والے ان پر قلم آزمائی کریں میری غرض لائف نگاری سے نہیں بلکہ صرف تنقید ادبی (یعنی لٹریری ریویو) چاہتا ہوں جس میں بہ لحاظ فن فرداً فرداً ہر مصنف کے نتائج فکر کی خصوصیات اس طرح دکھائی جائیں کہ ایک حد تک تنقیدات عالیہ (یعنی ہائر کرٹیسزم) کا حق ادا ہو جائے۔"

اپنی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے انھوں نے جن ادیبوں کا انتخاب کیا تھا اس سے ان کے ذوق انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ یعنی انھوں نے سرسید پر لکھنے کیلئے سجاد حید ریلدرم، نذیر احمد کیلئے سید افتخار عالم۔ حالی کیلئے مولوی عبدالحق شبلی کیلئے مولوی عبدالماجد کو چنا تھا اور آزاد پر خود لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

اس ادبی پروگرام کے علاوہ اردو زبان کی ترقی کے لئے بھی وہ ایک منصوبہ رکھتے تھے انھوں نے اپنے مضامین میں بار بار بتایا کہ اگر ہمیں اپنی زبان کو وسیع کرنا اور ترقی دینا ہے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اردو کی ایک جامع لغت تیار کی جائے محاورات اور اصطلاحات کی لغات الگ ہوں۔ دو لغتیں ایسی بھی ہونی چاہئیں جن میں عربی و فارسی کے وہ مروجہ الفاظ ہوں جو ہماری زبان میں مستعمل ہیں ایک مستند قواعد اردو اشد ضروری ہے ادب الاساتذہ یعنی زبان کے مشہور ادیبوں کے کارنامے کم سے کم ۱۲ ضخیم جلدوں میں پیش کئے جائیں فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب ہونا چاہیئے اور آخر میں ایک انسائیکلوپیڈیا ضرور تیار کی جائے جس میں تمام مروجہ علوم اور معلومات پیش کی جائیں ظاہر ہے کہ ان اسکیموں کی معقولیت سے آج بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مہدی حسن کے تخلیقی دماغ کی ایک اور اپج اس سے ظاہر ہے کہ انھیں انگریزی اصطلاحوں کے اردو مترادفات وضع کرنے کا بڑا شوق تھا خود وضع کرتے تھے اور اپنے دوستوں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے بعض اصطلاحوں کے ترجمے پر انھیں ناز ہوتا تھا اس کی وہ داد بھی چاہتے تھے مثلاً ([illegible]) کیلئے عوائد رسمیہ کی اصطلاح انھوں نے نکالی تھی اسی طرح (Higher Criticism) کے لئے تنقید العالیہ کلاسیکس کے لئے ادب العالیہ ۔ ماسٹر پیش کے لئے اختراع فائقہ ایپ سرفس کیلئے وظیفہ ادب وغیرہ وغیرہ اس قسم کے ترجموں کے علاوہ بعض ترکیبیں بھی انھوں نے وضع کی تھیں جنھیں وہ خاص خاص معنوں میں استعمال کر کے اپنی عبارت کو پر معنی اور رنگین بناتے تھے مثلاً خمیازۂ شباب، اقیاس الشباب، زہرۂ شباب، محبت کائنات اولیں، وغیرہ اس میں شک نہیں کہ ان کی ان ایجادوں میں سے بعض مقبول ہوئیں اور بعض لائق غور ضرور ہیں ۔

مغربی تعلیم نے ان کو ایک نکتہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایک اچھے ادبی نقاد کا فرض ہے کہ وہ صرف اپنی زبان اور ادب ہی کو مطالعہ میں نہ رکھے بلکہ یہ بھی دیکھے کہ اسکے زمانے کے سماجی اور سیاسی رجحانات براہ راست ادب و زبان پر کس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں مہدی حسن کی نظر اپنے ملک کی گذشتہ روایات کے ساتھ اپنے زمانے کی سماجی کیفیات اور سیاسی حالات پر بھی رہتی تھی اور ان کا یہی طریقہ فکر تھا جس کی بنا پر ہم انکا نام جدید تنقید نگاروں کی صف اولین میں رکھ سکتے ہیں انکے زمانے میں جو سیاسی حالات رونما ہو رہے تھے اور ان کا جو اثر اردو زبان و ادب پر پڑ رہا تھا یا پڑ سکتا تھا وہ سب انکے پیش نظر تھا ۔ جنگ عظیم کے دوران میں انھوں نے ایک مضمون شبلی سوسائٹی

کے عنوان سے لکھا تھا۔ دیکھئے اس میں کیسی بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"آج ہماری سیاسیات کی جو کچھ حالت ہے ظاہر ہے۔ ہماری اقلیت
انتشار ذرات کی حیثیت سے قوی تر عناصر میں بتدریج جذب ہوتی
جاتی ہے اور ہم ظاہراً بہت کچھ ابھرتے نظر نہیں آتے بیشک جو مطالبے
گورنمنٹ سے کئے جاتے ہیں وہ ملک کے قدرتی حقوق ہیں لیکن جب تک
فاتح و مفتوح کی زبان و مذہب اور قومیت ایک نہ ہو گورنمنٹ کے
طرز عمل یعنی پالیسی میں ہمارے جذبات کی کہاں تک رعایت ہو سکتی
ہے؟"

یا آگے چل کر اسی مضمون میں دیکھئے کس طرح متنبہ کرتے ہیں۔

"اس دور حریت میں اگر آپ اپنا ادب (لٹریچر) بھی کھو بیٹھے تو تاریخ
آگے چل کر آنکھیں دکھائے گی کہ ترقی تو خیر جس نقطہ پر ہم کو اپنی روایات
سابقہ کی بنا پر قائم رہنا تھا وہاں بھی نہ ٹھہر سکے۔ آج کل کی جنگی
اصطلاح میں ادبی حیثیت سے ہماری یہ شاندار پسپائی آئندہ دنیا
کے لئے واقعۂ عبرت ہوگی۔"

آپ نے دیکھا کہ ۱۹۱۶ء میں یہ ادیب اور نقاد کیا کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ اپنا دل
و دماغ محض ادب برائے ادب کے روایتی حسن میں کھوئے ہوئے نہیں تھا بلکہ اس
کی نظریں ان حالات اور اسباب کو دیکھ رہی تھیں جو کسی زبان یا ادب کی فنا و بقا کے
ذمہ دار ہوتے ہیں ملک کی اخلاقی حالت جو اس زمانہ میں مغربی تمدن کی ظاہری نقل
کرنے سے پیدا ہو رہی تھی اور اس کی خرابیاں جس قدر پھیل رہی تھیں یہ گوشہ بھی

بھی مہدی حسن کی غائر نظر سے بچا ہوا نہیں تھا لکھتے ہیں۔

"آج ہم میں سے بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ صرف خوش وضعی یعنی فیشن پر جان دیتا ہے اس کا لباس متمدنہ (کوٹ پتلون) اس کی امتیازی زندگی کا ایک ایسا مظہر ہے جس سے وہ باوصف کم استطاعی قطع نظر نہیں کر سکتا اس کی لطافت خیال نئی وضع کے دہرے کالر ریشمی ٹائی کی چھبتی ہوئی نشست سے آگے نہیں بڑھی گلے کی اس بندش کا تلازمہ اگر کہیں ہم رنگ موزے اور رومال سے ہو گیا تو پھر اس کے تخیل کی تکمیل کیلئے موجودہ دنیا میں کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں رہتی آپ یہ نہ سمجھیں میں اس خوش لباس حیوان ناطق کو اول درجے کے معیار سے گرا کر آدم کی ابتدائی پوشش پر لانا چاہتا ہوں میری غرض صرف یہ ہے کہ یہ طبقہ جس طرح ظاہری ٹھاٹھ کا گرویدہ ہے دماغی آرائش بھی اس کا مطمح نظر ہوتی اور یہ اردو لٹریچر سے اتنا مانوس ہو سکتا کہ ادبی رنگ رچ کر نکھر سکتا جس سے قوم دنیا میں آبرودار ہو کر رہتی۔"

آپ اس ادبی نقاد کا اس زمانے کے نقاد سے مقابلہ کیجئے جس کی نظر میں صرف نظم و نثر کا حسن و قبح رہتا تھا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ شروع بیسویں صدی میں تنقید کا مفہوم کتنا وسیع ہو گیا تھا اور مہدی حسن اس صنف ادب کو کس اونچے معیار پر لے جانا چاہتے تھے۔ وہ ادب میں بھی افادیت کے قائل تھے اور اسی لئے غالباً ان کے دوست احباب انھیں مہدی افادی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اکبر کا کلام مہدی کو اسی لئے پسند تھا کہ مہدی کے نزدیک اکبر کا کلام عصری جذبات و خیالات کا مرقع

ہوتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ بے غایت نہیں ہوتا انھوں نے اپنے زمانے کی شعر و شاعری پر جو رائے ظاہر کی تھی وہ غالباً اس قسم کی سب سے پہلی آواز تھی جسے آج کل ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کہا جاتا ہے۔ دیکھئے کس قدر صاف لکھتے ہیں:۔

"کسی خاص ردیف و قافیہ کے ساتھ چند الفاظ جو اتفاق سے کھپ سکیں ان کی پیوندکاری سے دو مصرعوں کی تیاری اگر شاعری ہے تو بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی بیجا ہے مائی ارزد، میری خاطر سے مان لیجئے کہ وقت کا اقتضا کچھ اور ہے محدود دائرہ سے باہر نکلئے اور دیکھئے اعلیٰ ترلٹریچر کے حقوق کیا چاہتے ہیں۔"

غرض کہ اسی طرح کے ادبی اور تنقیدی اشارے مہدی حسن کے مضامین اور مکتوبات میں جگہ جگہ بکھرے ملتے ہیں اور یہ تمام اشارے بلاشبہ اپنے معانی اور اسلوب دونوں اعتبار سے بڑی وقعت کے لائق اور اہمیت کے مالک ہیں۔ انکی تحریروں میں دوم درجہ کی کوئی چیز نہ ملے گی اسی لئے شبلی جو اپنے سامنے بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور دوسروں کی تعریف کرنے میں بہت زیادہ محتاط تھے مہدی حسن کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"کاش شعرالعجم کے مؤلف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے۔"

ایک دوسرے خط میں لکھا

"مضمون دیکھا نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے حیرت ہوئی کہ مہدی ہمارے پرانے دوست ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا۔"

اس کے زمانے کے تمام ادیب ان کی نگارش کے دلدادہ تھے اور ان کے خیالات کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سلیمان ندوی نے لکھا کہ

"ان کا قلم بارغ وبہار تھا۔ بلا کی شوخ اور شگفتہ طبیعت پائی تھی اچھے خاصے خشک فلسفیانہ مباحث میں بھی وہ اپنے طرز بیان سے رنگینی پیدا کر دیتے تھے۔"

حبیب الرحمان خاں شیروانی کو تو ان کے انداز بیان میں یونان کے رنگ تراشوں کی سی نزاکت اور شہدی نظر آتی تھی آج بھی ہمارے موجودہ تنقید نگار مہدی حسن کے متعلق بڑی اچھی رایوں کا اظہار کر چکے ہیں اور ہمارے تنقیدی ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں مہدی حسن کو نمایاں جگہ دی گئی ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا اپنی قبل از وقت وفات کی وجہ سے مہدی حسن کوئی مستقل تصنیف پیش نہ کر سکے خیال کیا یقین واثق تھا کہ اپنی ملازمت کی مدت ختم کرنے کے بعد ان کا مستقل مشغلہ تصنیف وتالیف ہوگا لیکن اکثر مخلوقات ہم سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ اور ہی ہے ۱۹۲۰ء میں دو تین مہینے کی علالت کے بعد یہ ادب کا پرستار بالغ نظر نقاد اور صاحب اسلوب انشا پرداز وہاں چلا گیا جہاں سے پھر کوئی نہیں آتا۔ ایک ستارہ جو افق تنقید پر بڑی آب وتاب سے چمک کر ابھر رہا تھا دفعتہً غائب ہو گیا لیکن آج تک اس کی وہ مختصر چمک دمک بھی ہم فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

(حافظ)

تنقید شعر بیسویں صدی میں

حالی نے سادگی، اصلیت اور جوش کی جو آواز آخر انیسویں صدی میں اپنے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اٹھائی تھی اس کا اثر باوجود مخالفت کے ہمارے شاعروں کے معیار و مذاق پر رفتہ رفتہ ہوتا رہا۔ اس کا احساس خود حالی کو بھی ہو گیا تھا ایک مصرع میں انھوں نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے ؎

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

ادھر انگریزی علم و ادب کے اثرات براہ راست ہمارے نوجوانوں پر پڑنے لگے تھے اور جو انگریزی سے ناآشنا تھے وہ کسی نہ کسی واسطے سے نئے اثرات قبول کر رہے تھے۔ مثلاً آرزو لکھنوی جو انگریزی ادب سے ناآشنا تھے جب ۹ء یا ۱۰ء میں سندیلہ میں مقیم تھے اور ان کی زبان دانی کے جوہر نئے نئے کھلنے شروع ہوئے تھے تو وہیں ان کے ایک بیرسٹر دوست اکثر ان کو انگریزی شاعری سے

نکات اور رموز سمجھاتے رہتے اور واقعیت اور فطرت پسندی کی طرف مائل کرتے تھے
مختصر یہ کہ شروع بیسویں صدی میں انگریزی علوم وادبیات کا چرچا ہمارے
اس مذاق شاعری کو جو محض رعایت لفظی، صنائع و بدائع کے استعمال بندش
الفاظ اور پابندی روزمرہ کو معیار حسن وقبح بنائے ہوئے تھا بہت کچھ بدلنے
اور واقعیت پسندی کی طرف لانے میں معاون ثابت ہوا اور باوجود ہمارے
لکیر کے فقیر شعرا کی ضد اور مخالفت کے اس زمانے کے نوجوان شعرا اور ادیب
رفتہ رفتہ دوراز کار، فضول اور لایعنی قیاس آرائیوں سے پرہیز کرنے لگے غزلوں
کے علاوہ نظموں پر بہت کافی توجہ دی جانے لگی اور غزلوں میں بھی وہ مشاہدات اور
تجربات راہ پانے لگے جن کا تعلق ہماری اپنی زندگی سے کسی نہ کسی صورت سے کم
وبیش ہوتا تھا۔ خیالی یا ماورائی محبوب کی طرف اشارے کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ
ارضی محبوب کی طرف منتقل ہونے لگا اور تصوف کی گیرائی جو تمام ادب پر عموماً اور
شاعری پر خصوصاً نہایت گہری تھی ختم ہونے لگی یعنی ہیئت اور صورت اور
انداز بیان کے علاوہ معنویت میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اخلاقی، ملکی اور
ملی مسائل بھی نظموں کا موضوع بننے لگے۔ یہ ضرور ہوا کہ پہلے وہ رومانوی انداز
جو زیادہ تر لفاظی سے عبارت تھا اب جو مغرب کی نیچر پرستی کے تتبع میں پیش
ہوا وہ بھی تجربہ و مشاہدہ سے زیادہ تصور و تخیل پر مبنی تھا شرر اور محمد علی طبیب کے ناولوں
کے بیشتر ابواب محض نثر میں شعر و شاعری کی کوشش معلوم ہوتے ہیں۔

شروع بیسویں صدی میں جہاں تک فن تنقید کا تعلق ہے شبلی کے موازنہ اور شعر العجم
کی مقبولیت کے باعث تشریحی انداز بہت زیادہ رواج پا گیا تھا۔ یہ انداز اب بھی کہیں

کہیں ہمیں نظر آجاتا ہے تشریحی انداز کی خصوصیت یہ ہے کہ کسی شاعر کی خصوصیات شاعری بیان کرنے کے سلسلے میں اس کے کسی شعر کا مفہوم پہلے ہی نہایت تشریح و تفصیل سے لکھا جائے پھر وہ شعر پیش کر دیا جائے یعنی سامعین کو پہلے ہی سے کسی شعر کی پہنائی اور وسعت یا گہرائی اور گیرائی یا نزاکت تخیل کا رعب ڈال کر تیار کر دیا جاتا ہے تاکہ شعر کا اثر بھر پور ہو سکے اسے استقرائی انداز بھی کہہ لیجئے۔ دراصل یہ ایک قسم کا خطیبانہ انداز ہے ۱۹۲۵ء یا ۱۹۳۵ء تک جتنی تنقیدیں لکھی گئیں وہ تقریباً سب اسی انداز کی ہوتی تھیں ان میں سے عبدالرحمان بجنوری کے محاسن کلام غالب اور مہدی حسن کی بعض تحریریں بہت مقبول ہوئیں اسی طرز کی کاوش میں تنقید نگار کو اپنی وسعت معلومات کا مظاہرہ کرنے کا بھی اچھا موقع ملتا تھا مگر بعض اوقات اپنی سخن فہمی کے زعم میں ایسی تشریحیں کر جاتا تھا جو شاید اصلی مصنف یا شاعر کے وہم و خیال میں بھی نہ آئی ہونگی اکثر اس قسم کی تنقید ایک تقریظ یا معذرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور صاف آورد بھی معلوم ہوتی ہے یعنی صریحی طور پر پہلے ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ نقاد کس شعر کا تعارف کرانے کی ایک زحمت بے بلیغ اٹھا رہا ہے شبلی ابوالکلام حبیب الرحمان خاں شیروانی وغیرہ اسی قسم کے نقاد ہوئے ہیں۔

دوسرا گروہ جوان نقادوں کے علاوہ پیدا ہوا اس نے نظم و نثر دونوں کی تنقید کے سلسلے میں زیادہ معقول طریقہ اختیار کیا یہ لوگ برخلاف پہلے گروہ کے انگریزی علم و ادب سے براہ راست متعارف رہ چکے تھے۔ انھوں نے کسی شاعر یا مصنف کے عہد کے فکری اور ادبی رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے اس مصنف کی زندگی اسکی سیرت انکار

و اعتقادات پر نظر ڈالی اور پھر اس مصنف کے نظریۂ حیات و ادب کو پیش کرنے کی کوشش کی ا سے ہم تحقیقی تنقید کا نام دے سکتے ہیں اس قسم کی تنقید کی علمبردار مولوی عبدالحق کی ذات ہے انھوں نے مختلف شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف پر بڑی محنت سے مقدمے لکھے بے جا عبارت آرائی سے پرہیز کیا اور کسی ادیب یا شاعر کا جو مقام واقعی طور پر تاریخ ادب میں قائم ہو سکتا تھا اس کے متعین کرنے کی کوشش کی ہے مولوی عبدالحق، شیخ چاند، عبدالقادری، محی الدین زور، مسعود حسن رضوی وغیرہ ایسے تحقیقی نقادوں کی صف میں آتے ہیں آج کل بھی یہ انداز بہت وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس طرز میں تحقیق زیادہ اور تنقید کم ہو جاتی ہے اور بسا اوقات تحقیقی شغف کی وجہ سے تنقید میں وہ توازن برقرار نہیں رہتا جو عام طور پر ہونا چاہیے یعنی بعض اوقات ناقد ایسی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دے دیتا ہے جو کسی اہمیت کی یا اتنی زیادہ اہمیت کی حق دار نہیں ہوتیں اس کے علاوہ کسی ادیب یا شاعر پر حد سے زیادہ شغف کی وجہ سے اس ادیب یا شاعر سے ایک فطری لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے جسے آرنلڈ تاریخی لگاؤ کہتا ہے لیکن جسے ذہنی لگاؤ کہنا بہتر ہوگا۔ یہ لگاؤ جب پیدا ہو جاتا ہے تو نقاد کی نظر اس قدر خارجی نہیں نہیں رہ جاتی جتنی کہ ہونا چاہیے اور اس طرح تحقیقی نقاد بھٹک جاتا ہے مختصر یہ کہ اس انداز تنقید میں محنت کے علاوہ صحیح توازن دماغی کی بھی بڑی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

حالی اور عبدالحق کی قائم کردہ تنقید کی یہ صورت حال تھی جب ۱۹۳۳ء سے فرائڈ اور مارکس کے فلسفہ کے اثر سے تبدیلی ہونا شروع ہوئی اس سے تدیمی النظر گر

والوں کے نزدیک بے راہ روی کے دروازے کھل گئے جنسیات اور بھوک سے دیوآزاد ہو گئے۔ بیکار لیکن ذہین نوجوانوں کو ایک طرف نظری آسودگی دوسری طرف بغاوت کا ایک آلہ کار ہاتھ آیا نتیجے دیکھتے دیکھتے ہمارے ادبیات میں ایسے کھیل کھیلے جانے لگے جن سے فضا رنگین ہو گئی اور ادبی قیادت بزرگوں کے ہاتھ سے نکل کر نوجوانوں کے ہاتھ میں آگئی اور اب آئی ہے تو جائے کہاں لیکن ان نوجوانوں میں کچھ سنجیدہ مزاج کے لوگ بھی ہیں انھوں نے اس نقطۂ خیال کو فکری یا فلسفیانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی اور بڑی متانت اور جوش سے اس مادی نقطہ نظر کو پیش کرنا شروع کیا ان کے نظریوں کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ حسن و حقیقت اضافی چیزیں ہیں مطلق نہیں اس لئے ہم کسی حقیقت کو خواہ وہ کسی نظریے کی شکل میں ہو، ذی روح ہو یا بے روح، فکر و نظر کی آخری منزل نہیں قرار دے سکتے۔ ہر حقیقت کچھ عرصہ بعد اپنی ایک ضد پیدا کر لیتی ہے پھر اس ضد کی ضد پیدا ہو جاتی ہے اس طرح حقیقت کا منتہائے نظر بام عروج پر منزل بہ منزل ترقی کرتا رہتا ہے انھوں نے یہ بھی کہا کہ انسان کی مادی ضرورتیں دراصل اس کی فکر و نظر کی پرواز اور سمت مقرر کرتی ہیں اس لئے کسی شاعر یا ادیب کے کارناموں کو پرکھتے وقت اس کی معاشی حالت کو پیش رکھنا ضروری ہے یہی نہیں بلکہ ہر شخص چونکہ کسی جماعت یا سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اس لئے اس کے سماج کے اقتصادی حالات کا تجزیہ بھی لازم ہے تاکہ اس کے عہد کی فکری کیفیات اور معیار متعین ہو سکیں ان اصولوں نے تنقید کو ایک نیا روپ دیا یعنی یہ کہ حقیقت بالکل ختم ہو گئی۔ مادی ضروریات اور ان کی تسکین کو اولیات کا درجہ دیا گیا

ہر ادب پارے کی اچھائی یا برائی کا پیمانہ بتایا گیا کہ وہ کہاں تک عوام کی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے گویا اس طرح ادب کو جمہوری بننے کا شرف حاصل ہوا نظیر اکبر آبادی جن کو شیفتہ نے اپنے تذکرے میں لائق ذکر بھی نہ سمجھا تھا اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر شمار ہونے لگے ان نقادوں نے اپنے آپ کو ترقی پسند کہا دوسری جنگ عظیم کے بعد پھر ان ترقی پسندوں نے نئے ادب کے نام سے ایک نئی تحریک اٹھائی جس کا مقصد یہ ہے کہ ادب چونکہ ایک سماجی ضرورت کو پورا کرتا ہے اس لئے اسے سماج کو بہتر سے بہتر بنانے کی جد وجہد میں ایک آلۂ کار بنایا جائے اس مختصر گروہ میں ڈاکٹر عبد العلیم، سجاد ظہیر، احتشام حسین، سبط حسن وغیرہ پیش پیش ہیں دراصل اس گروہ کا مقصد سماج کو ایک خاص مادی نظام کے تحت لانا ہے لیکن یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ادب کو جب کسی مقصد کے تحت لایا جاتا ہے تو وہ ادب کے بجائے تبلیغ یا صحافت ہو کر رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس ترقی پسند ادب میں آپ کو عموماً صحافتی انداز اور تبلیغی رنگ نظر آئے گا ادب بہت کم یا بالکل نہیں یہ صحیح ہے کہ آج کل یہ نقطۂ نظر ہمارے نوجوانوں میں بہت مقبول ہے لیکن اس کی وجہ محض ذوقِ ادب نہیں بلکہ زیادہ تر ہندوستان کے وہ معاشی حالات ہیں جن کی وجہ سے ہمارے بہت سے ذہین نوجوان بیکار ہیں۔

ان مادی ترقی پسند لوگوں کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر کچھ اہلِ تنقید ایسے بھی ہیں جو ادب کو کسی مقصدیت کے تحت لا کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھتے وہ ہر ادب پارہ کو خواہ اس میں کوئی مقصد ہو یا نہ ہو اس کی ادبیت پر پرکھنے کے قائل ہیں ادبیت ان کے نزدیک اول شے ہے کچھ اور بعد کو۔ ادبیت سے ان کی مراد انداز بیان کا حسن ہے

جس کے بغیر کوئی ادب ادب نہیں کہلایا جا سکتا ان نقادوں کے نزدیک ہر ادیب اور شاعر کی صحیح قدر و قیمت پہچاننے کے لئے اس کی پرواز تخیل کے ساتھ پرواز ضروری ہے تاکہ اس کے تخلیقی کارنامے کی رفعت و بلندی یا گہرائی اور گیرائی کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ اس قسم کی تنقید کو "تخلیقی تنقید" کا نام دیا گیا ہے اور اس انداز کو کامیابی کے ساتھ برتنے والوں میں آل احمد سرور مجنوں گورکھپوری فراق گورکھپوری، کلیم الدین، اختر اورنیوی وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ انداز نظر بڑی تازگی اور شگفتگی رکھتا ہے اور اکثر وہ لطف بھی جو کسی تخلیقی شاہکار میں نظر آتا ہے لیکن بسا اوقات اس قسم کی تنقید نگاری میں نقاد اپنی تخلیق فکر میں زیادہ مصروف ہو جاتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اپنے موضوع کی تنقید کرے یعنی اپنے آئینے میں کسی غیر کا عکس دیکھنے کے بجائے خود نمائی میں زیادہ مشغول ہو جاتا ہے اس کے علاوہ اس قسم کے نقاد کبھی کبھی اپنے موضوع کے متعلق کافی تحقیق سے کام نہیں لیتے اور محض کسی خوش فہمی پر یا وہم و گمان پر اس کی خصوصیات کی بنیاد رکھ لیتے ہیں اس لئے غلط نتائج پر پہنچ جاتے ہیں اس طرح کبھی تو کسی ادیب یا شاعر کو اس کی حدوں سے بڑھا دیتے ہیں کبھی کم دکھاتے ہیں پھر ایسے نقاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جس ادیب یا شاعر کو پرکھے اس سے زیادہ خود فکر و نظر کی صلاحیتیں رکھتا ہو ورنہ اس شاعر یا ادیب کے ساتھ ہرگز انصاف نہ کر سکے گا۔

یہ ہیں وہ مختلف دھارے جو آج کل ہماری تنقیدی ادب میں نظر آتے

ہیں شاعری، افسانہ، ناول اور مضمون نویسی ہر صنف ادب ہمارے یہاں میں سے کسی نہ کسی کی چھاپ ہے کچھ پرانے بزرگ ایسے بھی ہیں جو زبان و محاورہ اور بندش کی درستی کو ہر ادیب یا شاعر کے لئے فرض اولیں قرار دیتے ہیں اور اس کی بحث کے بغیر کسی ادیب کو ادیب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں نیاز فتحپوری کے مالہ وما علیہ اور عبدالماجد دریابادی کی رعایت لفظی کے شوق سے تنقید کا کون طالب علم واقف نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی رایوں سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا یعنی یہ کہ کوئی شخص چاہے جتنا بڑا مفکر کیوں نہ ہو اگر وہ ادب کے کوچے میں قدم رکھے گا تو زبان و محاورے پر عبور رکھے بغیر کیونکر زبان کھول سکے گا؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ زباندانی پہلا قدم ہے منزل نہیں اور تنقید کی ساری عمارت اس سنگ بنیاد پر قائم کی جا سکتی ہے اٹھائی نہیں جا سکتی۔

آئندہ ہماری تنقید کی منزلیں اور راستے کون سے مقرر ہوں گے اس کا صحیح اندازہ ابھی لگایا نہیں جا سکتا کچھ لوگ نفسیاتی نقطۂ نظر کے حامی ہو رہے ہیں ان کا خیال ہے کہ ہر شاعر یا ادیب کو سمجھنے یا پرکھنے کے لئے اس کی تحریروں کی نفسی تحلیل یا نفسیاتی تجزیہ ضروری ہے تاکہ اس کے شعور اور لاشعور تک نقاد کی رسائی ہو سکے کچھ لوگ اس رائے کے ہیں کہ ادب میں اگر جمال نہیں تو وہ ادب نہیں کہا جا سکتا اس لئے فن جمالیات کو پوری طرح سمجھا جائے اس کے متفق اصول مقرر کئے جائیں اور پھر ان اصولوں کے مطابق وضاحت کے ساتھ صحیح طور پر کسی فنی شاہکار کے حسن و قبح متعین کئے جائیں یہ سب صورتیں بظاہر پیش نظر

میں آئندہ دراصل ہماری تنقید نگاری کیا صورت اختیار کرے گی قطعی طور پر کوئی پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی اسلئے کہ ہماری آج کل کی زندگی بہت کچھ دینا کے اور ملک کے سیاسی اور معاشی حالات پر منحصر ہو گئی ہے اور یہ حالات ابھی ہیگ ابتدائی کی صورت میں ہیں جب تک وہ کوئی واضح صورت اختیار نہ کریں ادبی اور تنقیدی رجحانوں کا رخ قطعی طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ پائیدار ادب امن و آشتی کی حالت میں پروان چڑھتا ہے ہنگامی حالات میں نہیں۔

شاعری میں وطن پرستی

(۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک)

اردو شعر و شاعری میں وطن پرستی کے ارتقا کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم اس لفظ کے مفہوم کو متعین کریں وطن پرستی کے ایک تو وہ معنی ہیں جس کا تعلق ہمارے قلب و جذبات سے ہے یعنی ہم جہاں پیدا ہوتے، بڑھتے اور نشو و نما پاتے ہیں قدرتی طور پر اس جگہ سے لگاؤ، انس یا محبت ہو جاتی ہے وہ شہر یا بستی ہمارے خمیر میں رچ جاتی ہے اس بستی یا مقام کا ایک ایک کوچہ، ایک ایک گلی ایک ایک موڑ ہماری زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے دنیا میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جسے اپنی جنم بھومی، اپنے وطن سے یہ فطری محبت نہ ہوتی ہو۔ اسی کو حب الوطنی کہتے ہیں۔

دوسرا مفہوم وطن پرستی کا جو مغرب کی ٹکسال میں ڈھل کر رائج ہوا ہے وہ ایک سیاسی حیثیت اور سیاسی معنی رکھتا ہے یعنی کسی ملک میں اسی ملک والوں کی حکومت کا ہونا اور کسی غیر ملکی حکومت کا برداشت نہ کرنا اس مفہوم کو سیاسی

اصطلاح میں وطنیت، بھی کہتے ہیں۔

ہمارے ایشیا میں وطن پرستی کا پہلا مفہوم تو ہمیشہ سے رائج تھا فارسی کی یہ مشہور رباعی کس نے نہ سنی ہوگی۔

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر — خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بملک مصر شاہی می کرد — میگفت گدا بودن کنعاں خوشتر

لیکن وطن پرستی کا دوسرا مفہوم اس وقت سے رائج اور مانوس ہوا جب انگریزی تعلیم کی بدولت مغرب کے علم و ادب اور سیاست کے نظریئے مشرق میں متعارف ہوئے چنانچہ ہندوستان میں بھی ۱۸۵۷ء سے پہلے اور بہت دنوں بعد بھی عوام الناس وطن پرستی کے اس سیاسی مفہوم سے ناآشنا محض رہے ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی شعور تھا وہ بادشاہت سے زیادہ نہ سوچ سکتا تھا ہندوستانیوں نے تو ہمیشہ مختلف بادشاہوں کے ہی تختے الٹتے پلٹتے دیکھے تھے جمہوریت یا کسی اور قسم کی طرز حکومت کا تو یہاں سایہ بھی نہ پڑا تھا تو یہاں کے لوگ بادشاہت کے علاوہ سوچ بھی کیا سکتے تھے اسلئے جب تک مغربی علوم سے یہاں کے لوگ آشنا نہیں ہوئے یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی وطن پرستی کے اس سیاسی اور اصطلاحی معنی سے بالکل ناواقف رہا۔

ہاں حب الوطنی کے جذبے سے متاثر ہو کر کئی شاعروں نے مختلف نظمیں لکھیں بسنت، برسات اور دیگر موسموں کا بیان، پنگھٹوں اور مقامی میلوں اور تماشوں کا ذکر ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے قلی قطب شاہ، میر تقی میر، فائز دہلوی اور نظیر اکبرآبادی کی نظموں میں بہت ملتا ہے ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے یا کچھ بعد شیفتہ نے ایک پوری غزل

ہندوستان کی تعریف میں لکھی تھی حالانکہ اس میں تغزل نمایاں ہے لیکن غالباً یہ سب سے پہلی غزل ہے جو ہندوستان کی تعریف میں اس زمانے میں لکھی گئی۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

بندگی وہ زمیں ہے عشرت خیز — کہ نہ زاہد کریں جہاں پرہیز
وجد کرتے ہیں کی کے مے صوفی — مست سوتے ہیں صبح تک شب خیز
رندیاں تو شاہد مے سے — پارسا کو نہیں گزیر وگریز
ہے غریبوں کو جرأت فرہاد — ہے فقیروں کو عشرت پرویز
عیش نے یاں بٹھا دیا ناقہ — غم نے کی یاں سے رخش کو مہمیز
کو جانتا بھی نہیں — جز غم عشق سوئے عیش آمیز
باد صرصر یہاں نسیم چمن — ناز عنصر سے آتش گل تیز
بوستاں کی طرح یہاں صحرا — دلکشا، دلپذیر، دلآویز
شیفتہ مقام لو عنان قلم — یہ زمیں گرچہ ہے ہوس انگیز

ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو ہمارے ادب میں ایک سنگ میل کا درجہ اور نچا رہا ہے سیاسی اور تاریخی اعتبار سے ہندوستان میں کب ایسے انقلابات نہیں ہوئے پہلے زمانے کی تقریباً ہر صدی اس ہنگامے سے زیادہ خونچکاں حالات اور انقلابات سے داغدار ہے میرے خیال میں اس ۱۸۵۷ء سے زیادہ پر انقلاب وہ تاریخ ہے جب انگریزوں نے میکالے کی خواہش کے مطابق ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وڈ کے مشورے سے یہ طے کر دیا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم انگریزی میں دی جائے انگریزوں نے یہ طریقہ اختیار تو کیا تھا دراصل اپنی آسانیوں کے لیے لیکن ہوا یہ کہ نادانستہ

ور اپنے خزانوں اور کوٹھیوں کی کنجیاں انھوں نے اس طرح ہندوستانیوں
کے حوالہ کر دیں۔ سمسم کا یہ طلسم معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستانیوں پر ان کی سیاست
ن کی حکومت، ان کی چالاکیوں اور عیاریوں، خوبیوں اور خامیوں سب کے دروازے
ل گئے اور بہ آسانی معلوم کر لیا گیا کہ ان کی قوت اور اقبال کا راز کیا ہے۔ اور
بنے ہوئے سوداگر کہاں کہاں اور کیا کیا مال اپنی کوٹھیوں میں رکھتے ہیں۔ اس
اظ سے میرے خیال میں یہ تعلیمی انقلاب اس سیاسی انقلاب سے زیادہ اہم
ے خصوصاً یہ جاننے کے لئے کہ ہندوستانیوں میں عام سیاسی بیداری کیسے پیدا
ئی اور پھر اس کے دوررس اثرات زندگی اور ادب پر کیا پڑے لیکن اس بحث
ب مسئلے کو میں یہاں زیادہ نہ پھیلاؤں گا۔ بلکہ صرف یہ پیش کروں گا کہ ۱۸۵۷ء
ے بعد حب وطن کا جذبہ کیوں کر سیاسی قالب میں درجہ بدرجہ نشوونما کی ارتقائی منزلیں
ے کرنے لگا۔

۱۸۵۷ء اور اس کے بعد بھی عرصہ تک، جہاں تک سیاست کا تعلق ہے ہم
یکھتے ہیں کہ عام ہندوستانیوں میں کوئی خاص شعور سوائے مذہبی شعور کے نہ تھا اگر
ں مذہبی آڑ کا یہ چار اور پروپیگنڈہ انہ ہوتا تو غالباً یہ تحریک آزادی اتنی تیزی اور
دت سے ملک بھر میں نہ پھیل سکتی حب الوطنی کا جذبہ ہماری عام زندگی اور
ب دونوں میں موجود تھا لیکن یہ ایک انفرادی جذبہ سمجھا جاتا تھا۔ سماجی
ا اجتماعی طور پر اس جذبے میں ایسی قوت نہ تھی جو سب کو مجتمع بھی کر سکتی اور
ب طاقت بھی اٹھا سکتی جیسے آج کل مذہب کو محض انفرادی چیز سمجھا اور سمجھایا
تا ہے۔ اور وطنیت کو اجتماعی کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک معاملہ برعکس تھا۔

طور پر اس کے بالکل متضاد تھا۔ مذہب اجتماعی سیاسی شعور تھا اور وطنیت محض ایک
انفرادی جذبہ جس میں کوئی قوت اور سکت نہ تھی اور یہ صرف برائے شعر گفتن، خوب
سمجھا جاتا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بہت سے تختوں کا تختہ ہو گیا تھا
بہادر شاہ ظفر کی حکومت جاتی رہی تھی، واجد علی شاہ سے اودھ چھین لیا گیا تھا
بادشاہوں کو اور ان کی رعایا کو جس قدر افسوس ہوتا کم تھا مگر سوائے افسوس اور
غم کھانے کے وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ رعایا بے بس، خود کمزور شکایت کس سے
پاس لے جاتے سوائے بادشاہت کے اور کوئی سیاسی نظریہ پیش نظر نہیں تھا
کیا کرتے سوائے اس کے کہ نالہ و غم، گریہ وزاری کرکے زیادہ سے زیادہ اپنے
دل کی بھڑاس اپنے اشعار میں نکال لیتے اور وہ بھی مختلف پردوں میں، گل و بلبل
کا ذکر پیچ میں لکھے، تاکہ صیاد سمجھ نہ جائے۔ کڑی زبان بندی تھی۔ بہادر
شاہ ظفر کی یہ غزل ملاحظہ کیجئے۔

نے خود فراموش ہے نے تدبیر پر شاکر ہیں ہم — بس تو اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم
ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی — رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم
تو برا کہہ یا بھلا ہم سے نہ ہو تیرا گلہ — اے ستمگر تیری ہی تقریر پر شاکر ہیں ہم
لکھا پیشانی کا پیش آتا ہے ہم شاکی نہیں — کاتب تقدیر کی تحریر پر شاکر ہیں ہم

ہے ظفر ہم سا جفاکش کون زیر آسماں
ہر جفائے آسمان پیر پر شاکر ہیں ہم

کچھ اس طرح کی بے بسی اور مظلومی کا اظہار واجد علی شاہ اختر کی اس غزل

میں بھی لکھتا ہے سنئے۔

منہدم شہر کی بنیاد کروں یا نہ کروں! | نالہ و زاری و فریاد کروں یا نہ کروں
قاتلا سر بھی کٹا پر نہ ہلی اپنی زباں | دہنِ زخم سے فریاد کروں یا نہ کروں
اپنے احباب بھی سرکش ہوئے اللہ اللہ | تجھ سے شکوہ ستم ایجاد کروں یا نہ کروں
لو گرفتارِ قفس ہوں مجھے کر دے آگاہ | غلغلہ دام میں صیاد کروں یا نہ کروں
نہ تو غم کھاؤ نہ چپ بیٹھو، نہ رُوو نہ کڑھو | اختر اس جور سے فریاد کروں یا نہ کروں

ان دونوں محزوں بادشاہوں کے کلام سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کہیں کسی قسم کا کوئی سیاسی جذبہ نہیں تھا۔ البتہ غم و افسوس یا صبر و شکر کے جذبات یا گردش روزگار کی شکایت ملتی ہے اور یہ بالکل مطابق فطرت ہے۔

یہ تو ان بادشاہوں کا حال تھا شاعر بے چارے کس شمار میں تھے وہ بھی ۱۸۵۷ء کو محض ان انقلابوں میں سے ایک سمجھتے تھے جو گردش روزگار کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں اس لئے ان کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ غالب اس زمانے کے سب سے بڑے شاعر ہیں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے بعد انگریزوں نے جو مظالم دہلی میں کئے اس پر ان کا جی بہت کڑھا اپنے خطوط میں انھوں نے جگہ جگہ دہلی کی تباہی کے حالات رو رو کر قلم بند کئے ہیں ایک کتاب فارسی میں بھی ۱۸۵۷ء کے حالات پر لکھی کچھ عرصہ تک ان کی پنشن بھی انگریزوں نے بند رکھی، ان سب باتوں کے باوجود غالب اس کی ہمت نہ کر سکے کہ اپنے اشعار میں علانیہ کچھ انگریزوں کے خلاف لکھ سکتے صرف ایک قطعے میں عبرت کے طور پر کچھ اشعار اس قسم

کے لکھے ہیں۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء کے وقت اور اس کے بعد بھی چند سال تک وطنیت کا شعور تو در کنار کسی قسم کی خالص سیاسی تحریک یا بیداری ہمارے ادب یا زندگی میں واضح طور پر نظر نہیں آتی اگر کسی قسم کا جذبہ تھا تو وہ مذہبی رنگ کا تھا ہندو اور مسلمان دونوں یہ محسوس کرتے تھے کہ عیسائیوں کی ہم پر حکومت ہو گئی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے۔

خالص وطنیت کا سیاسی شعور اس وقت بیدار ہوا جب ہندوستانیوں نے انگریزی زبان و ادب اور ان کے علوم سیکھے یہاں کے ذہین طلباء انگلستان جانے لگے اور وہاں انگریزوں کی طرز حکومت کو دیکھا اور اس کو سمجھا ان کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھا بعض ان میں سے انگریزوں کے اس سلوک سے غیظ و غضب میں بھی آئے جو اس وقت کا انگریز ہندوستانیوں کو "نیٹو" سمجھ کر کیا کرتا تھا ان سب اثرات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ ہماری سیاسی آزادی کی شاہراہ کا یہی پہلا سنگ میل ہے یہی وہ سال ہے جس میں صحیح طور پر وطنیت کا پودا ملک میں لگایا گیا جو بہت جلد بلوغ و پختگی کی منزلیں طے کرنے لگا یہاں تک کہ شروع بیسویں صدی میں اپنے پورے شباب پر پہونچا جب چکبست، اقبال اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ

نے اپنی شاعری میں کھلے بندوں سیاسی آزادی کے مطالبات پیش کرنا شروع کر دیے لیکن اس سے پہلے انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس پودے کی محض آبیاری ہو رہی تھی۔ انگریزی علم و ادب کے مطالعے سے ہمارے ادیب آشنا ہو کر مغرب کے شاعرانہ اسالیب وہاں کے موضوعات اور وہاں کی فکر و تخیل کے انداز سے مانوس ہو رہے تھے چنانچہ مومن اور غالب کے دور کے بعد اس زمانے کے نوجوان شاعروں نے انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر اس کی تقلید کرنا شروع کی غزلیں چھوڑ کر نظمیں لکھنا شروع کیں اور گل و بلبل کے افسانوں کے بجائے کسی مفید موضوع پر سخن آرائی کی ابتدا کی آزاد اور حالی ان شعرا کے سرگردہ تھے آزاد کی ایک نظم کے چند اشعار سنیے جو انھوں نے حب الوطنی پر لکھی تھی۔

کب تک شب سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں ہم
اور جو کہ ہموطن ہوں وہ ہمدرد ہوں ہم

تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریز جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دل خاص و عام ہوں

حالی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور انھوں نے ملک کی بھلائی کے لئے اتحاد کا سبق دینا شروع کیا۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا گر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے بہت خوش ہو کر ایک ترانہ لکھا جس کے دو بند یہ ہیں:۔

سنے گا مسرت کا اب شامیانہ　　بجے گا محبت کا نقار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

کریں سب مدد ایک کی ایک مل کر　　یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اٹھ جائے چھپّر　　کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی نے تو بڑی پیاری نظمیں ہند کی تعریف میں لکھیں مثلاً ایک نظم "گلزار وطن" کے چند اشعار سنئے۔

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں　　حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں
پھولوں میں جس چمن کے ہو بوئے جاں نثاری　　حب وطن کی قلمیں ہم اس چمن سے لائیں
فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنج دلکش　　سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں
حب وطن کے لب پر ہوں جانفزا ترانے　　شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں
چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فزا ہو　　جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

شبلی نعمانی ایک بے باک آدمی تھے انھوں نے تو بیدھڑک سنانا شروع کی۔

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیداد و بلا تا کے
یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

نگارستانِ خوں کی سیر گو تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخمہائے خوں چکاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک کی خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

آپ نے دیکھا کہ یہ انیسویں صدی کے آخری کا زمانہ ہے حب الوطنی کے جذبے
ے ساتھ ساتھ وطنیت کا سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے آزادی کی خواہش
اور شدید ہوتی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ لے اور بھی تیز ہو گئی
ی۔ چکبست۔ مولانا ظفر علی خاں حسرت موہانی اور اقبال وغیرہ نے اسی
بے کو اور بلند آہنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا تھا جس کی تفصیل سے آپ
خوب واقف ہیں۔

طلسماتی افسانے

طلسم، جادو، ٹو۔ نے، ٹوٹکے۔ دیو، جن، پریاں۔ کتنی دلچسپ اور کتنی آباد تھی
ہمارے تخیل کی یہ دنیا! پلک جھپکاتے ہم اس آفت کی ماری اور مصیبتوں سے
بھری، تنگ دنیا سے نکل کر کھلے، وسیع میدانوں اور وادیوں میں پہنچ جاتے
تھے جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا، جہاں حیرت، خوشی اور آزادی کے
سوا کچھ اور نہ تھا۔ جہاں کی ہر چیز حسین تھی اور جہاں سوائے غم عشق کے اور کوئی
غم نہ تھا جہاں اگر لڑائیاں بھی ہوتی تھیں تو فتح ہمیشہ خیر اور نیکی ہی کی رہتی تھی۔
اب سے ساٹھ ستر برس پہلے تک ہمارا تخیل اور ہمارے عقیدے حقیقت
اور واقعیت کی اس جکڑ بندی میں گرفتار نہ تھے جیسے کہ آج کل ہیں آج کل غم
روزگار کا مارا سوائے خودکشی کے اور کچھ نہیں کر سکتا لیکن پرانے زمانے میں
دل کی تمام کدورتیں اور دماغ کی تمام الجھنیں داستان گو کی پیچھے دار باتوں،

مزیدار فقروں اور طلسمی افسانوں میں چشم زدن میں فراموش کی جا سکتی تھیں۔

اب سے چالیس برس پہلے تک بھی لوگ دیو، پری، جن اور بھوت وغیرہ قسم کی مافوق الفطرت ہستیوں پر اعتقاد رکھتے تھے ان کو اسی دنیا میں موجود سمجھتے تھے ٹونے، ٹوٹکے، تعویذ اور جادو کے اثرات پر ایمان رکھتے تھے جب کبھی اس قسم کی داستانیں پیش کی جاتی تھیں تو دھیان میں بھی نہیں آتا تھا کہ ایسی چیزیں ناممکن ہو سکتی ہیں اب سے پچیس تیس برس پہلے بھی بعض لوگ ایسے موجود تھے جو طلسم ہوشربا کو حرف بحرف صحیح سمجھتے تھے۔

یوں تو دیووں اور پریوں کے تصورات اور طلسماتی افسانوں کی ابتدا کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جب سے آدمی پیدا ہوا اسی وقت ایسے قصوں کی بنیاد پڑ گئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر ملک اور ہر زبان میں ایسے مافوق الفطرت افسانے پاتے ہیں سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں میں تو اس کے دفتر کے دفتر موجود ہیں عربی میں الف لیلیٰ، انگریزی میں کنگ آرتھر کی کہانیاں اور فرانسیسی میں شارلیمان کی حکایتیں اس قسم کی کہانیوں کی مشہور مثالیں ہیں ہمارے اردو ادب کی عمر ابھی کچھ نہیں ہے پھر بھی اس میں اس قسم کے ادب کے بہترین نمونے موجود ہیں اردو میں یہ قصے یا تو فارسی سے ترجمہ ہوئے ہیں یا پھر سنسکرت سے فارسی ترجموں کے ذریعہ لیے گئے ہیں یا پھر انہیں میں کچھ گھٹا بڑھا کر نئے قصے گھڑ لیے گئے ہیں اس قسم کے مشہور و معروف قصے الف لیلہ، باغ و بہار، فسانۂ عجائب، قصہ حاتم طائی، طوطا کہانی، قصہ گل بکاؤلی، بوستان خیال، بستان حکمت ہیں اور پھر ان سب سے بڑھ کر داستان امیر حمزہ ہے اس کے

آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر سیکڑوں صفحات کی کئی جلدوں پر مشتمل ہے کل جلدیں سترہ ہیں اور کل صفحات سترہ اٹھارہ ہزار ہوں گے اس کا سب سے پہلا دفتر نوشیرواں نامہ اور پانچواں دفتر طلسم ہوشربا سب سے زیادہ مشہور ہیں نوشیرواں نامے کی دو جلدیں ہیں اور طلسم ہوشربا کی سات ان سب کے علاوہ مثنویوں میں بدر منیر گلزار نسیم، طلسم الفت اور خالص ہندوستانی قصوں میں کلیلہ دمنہ، بیتال پچیسی سنگاسن وغیرہ بہت معروف ہیں۔

یہ سب طلسماتی افسانے اس وقت کی پیداوار ہیں جب یہاں کی بڑی حکومتیں زوال پذیر تھیں۔ مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا محمد شاہ رنگیلے دلی میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ تمام صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور یہ خود مختار صوبے بھی آخر میں اسی زوال کے شکار ہو چکے تھے پورے ملک میں افراتفری مچی ہوئی تھی اودھ۔ بنگال اور دکن وغیرہ صوبوں کے امراء وسلاطین سب ایک باہری غیر قوم کے اقتدار میں رفتہ رفتہ آتے جا رہے تھے کسی بادشاہ میں انتظام کی صلاحیت تھی نہ عزم و حوصلہ ان تمام پریشانیوں کو بھلا دینے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ خود کو فرضی اور طلسماتی داستانوں میں بہلا دیا جائے اور آنکھوں پر غفلت کا پردہ ڈال لیا جائے۔

حسرت اور تعجب دراصل اس قسم کے افسانوں کے بنیادی عناصر ہیں بغیر حیرت و استعجاب کے طلسم کا قلعہ قائم نہیں رہ سکتا یعنی کوئی ایسی بات کہی جائے جس کا حل ہماری سمجھ میں نہ آسکے اور ساتھ ہی ہماری توجہ کو بھی اپنی طرف مبذول رکھے انسان کی فطرت میں تجسس اور کھوج لگانے کا مادہ ازل سے ہے اسی لئے ہر وہ

چیز جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی پوری طرح جاننے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے
کہ ہر عقدہ اور ہر گرہ اس پر کھل جائے۔ ہر طلسم سے وہ متحیر ہونے کے ساتھ ساتھ
سے سمجھنے کی بھی کاوش کرتا ہے اس کے علاوہ جب کسی قصہ میں دلچسپی پیدا ہو
جاتی ہے تو وہ اس قصے کے انجام کو بھی جاننا چاہتا ہے اسکے دل میں یہ خلش رہتی ہے
پھر کیا ہوا اور اسکے بعد پھر کیا ہوا ؟۔ پرانے زمانے میں آجکل کی طرح تھیٹر، سینما، ریڈیو
وغیرہ قسم کی دلچسپیاں تو تھیں نہیں جن میں مشغول ہو کر آدمی غم روزگار بھلا سکتا یا اپنے
و بہلا سکتا اس کے علاوہ اگر دوسری قسم کی کوئی اور دلچسپیاں پیدا کی جائیں تو ان
سے لطف اندوز ہونے کے لئے کثیر مصارف کی ضرورت پڑتی۔ داستان گوئی ایسا
م خرچ اور بالا نشین نسخہ تھا جس میں نہ اداکاروں کی ضرورت تھی نہ اسٹیج کی اور نہ سیٹنگ
یہ Settings) کی۔ نہ کسی قسم کے داخلے کا ٹکٹ ہوتا تھا بس ایک داستان گو ہوتا
تھا جو اپنی لسّانی اور چرب زبانی سے پورے مجمع یا چند دوستوں کے سامنے ایسے
نگین اور دلچسپ مناظر پیش کر دیتا تھا کہ سامعین محو ہو جاتے تھے بس اسی تصور کے
لی ویژن پر تمام دلکش مناظر پیش ہوتے تھے یہاں تک کہ داستان ختم ہو جاتی تھی بعض
استان گو بادشاہوں اور امیروں کے یہاں ملازم ہوتے تھے اور بعض بازاروں اور
یلوں میں اپنے فن کے جوہر دکھاتے تھے۔

داستان گوئی کا فن دراصل دل بہلانے کا فن تھا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ پریشان
دی وہ چاہے بادشاہ ہو یا فقیر مہاجن ہو یا مزدور سکون چاہتا ہے۔ تاکہ اسے بہ آسانی
یند آجائے اور وہ تازہ دم ہو کر پھر دوسرے دن کی محنت کے لئے تیار ہو جائے گا
استان گو سمجھتا تھا کہ اسے ایسے قصے سنانا ہیں جو پریشان دماغ کو سکون پہنچائیں۔ کیو

ہوئے اعصاب کو نرم کریں اس کی قوت فکر و تمیز بیدار نہ ہونے پائے بلکہ اس کا منتشر اور مقید تخیل حسین وادیوں اور مرغزاروں کے تصورات میں گم ہو کر سو جائے اس مقصد میں داستان گو کو بڑی مدد ملتی تھی اس زمانے کے لوگوں کے عقائد سے جو ایک ان دیکھی رنگین دیووں اور پریوں سے بھری طلسمی دنیا کے وجود کو مانتے تھے ایسی ان دیکھی دنیا کے مناظر کیا کیا نہیں دکھائے جا سکتے یہی وجہ ہے کہ ہمارا داستان گو اپنے بے پناہ تخیل کی مدد سے ایسی جولانیاں دکھاتا تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

عموماً ان قصوں میں کیا ہوتا ہے؟ ایک بادشاہ یا شاہزادہ یا مجاہد ہوتا ہے اور زیادہ تر وہ کسی خوب صورت پری زاد حسینہ کو حاصل کرنے کے لیے یا کسی حق کو ناحق پر فتح دلانے کے لیے نکلتا ہے اس کو اپنے مقاصد کی انجام وہی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں نہیں معلوم کتنی منزلیں سر کرنا پڑتی ہیں کیسے کیسے جادو اور طلسم کے قلعوں کو فتح کرنا پڑتا ہے تب جا کر آخر میں اسکی آرزو برآتی اور پوری ہوتی ہے اور وہ اپنے مقصد سے ہمکنار ہوتا ہے ضمناً۔ نئے نئے قصے داستان در داستان شروع ہو جاتی ہے جگہ جگہ شہزادیاں، شہزادے، وزیر زادے، سوداگر بچے، چور دروازے، سرنگیں مدفون خزانے تہ خانے، جگہ جگہ مختلف قسم کے طلسمی کارخانے، سحر کی رنگینیاں، جادوگروں اور جنوں کی لڑائیاں ان سب کے ساتھ ساتھ بزم آرائیوں کے لیے بھی نئے نئے اور دلچسپ مرقعے پیش کئے جاتے ہیں غرضیکہ تصور کو مسحور اور مدہوش بنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔

آپ ان تمام باتوں کو زندگی سے فرار کہہ لیجئے صحیح ہے لیکن زندگی میں وقتی فرار کون نہیں چاہتا فکر و محنت کے بعد آرام و بےفکری کی کس کو خواہش نہیں ہوتی اور

وقتی آرام و سکون کی قدر و قیمت سے کون انکار کر سکتا ہے البتہ یہی سکون و آرام
زندگی کا فلسفہ بن جائے تو یہ چیز فرد اور قوم دونوں کے لئے مضر ٹھہرتی ہے
یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض ناقدین ادب نے اس قسم کے طلسماتی افسانوں کو بالکل
فضول اور حقیقت سے دور گردانا ہے ہر زمانے کا فراری ادب اور فن اپنے ماحول
کے معیار کے مطابق ہوا کرتا ہے جس زمانے میں یہ طلسماتی افسانے لکھے گئے اس زمانے
میں یہی طریقہ دلچسپی اور وابستگی کا تھا اس لئے ان طلسماتی افسانوں کی صحیح قدر و قیمت
کا پرکھنے کے لئے ان کو اپنے تاریخی ماحول کے پس منظر میں دیکھنا ہوگا کیا آج بھی فراری
ادب اور فن ہمارے یہاں رائج نہیں ہے کیا آج بھی ہم تخیل اور تصور میں وہ چیزیں
حاصل کرنا نہیں چاہتے ہیں جو ہمیں اصلی زندگی میں میسر نہیں؟ فرق صرف زمانہ اور
اس کے معیار کا ہے اس لئے ان افسانوں کو فضول کسی طرح ٹھہرایا نہیں جا سکتا
رہی حقیقت سے دوری تو جہاں تک ان افسانوں کے پلاٹ اور پس منظر کا تعلق ہے
وہ ضرور ایک طلسماتی دنیا کے ہیں لیکن ماحول و معاشرت رہن سہن کے طریقے
سب اسی دنیا کے ہیں اور سب اسی زمانے کی ہندوستانی معاشرت کی غمازی
کرتے ہیں اور وہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ وہ چاہے مثنوی بدر منیر ہو یا طلسم
ہوش ربا، مقامی ہندی رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔

جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے ان داستانوں میں ایک بے پناہ رنگارنگی
ہے یہ ضرور ہے کہ ایک عام مشابہت ان سب میں پائی جاتی ہے اس لئے ان میں
اس قسم کے کردار تو ہرگز نہیں ہیں جیسے کہ ہم کو مغرب کے ڈراما نگاروں کے یہاں
ملتے ہیں، پھر بھی ان کے اوصاف ایک دوسرے سے اس قدر جداگانہ ہیں کہ ان

سب کو ایک دوسرے سے بآسانی ممتاز کیا جاسکتا ہے مثلاً بزرجمہر کی مدبرانہ سیاست
امیر حمزہ کی شرافت بختک کی بزدلانہ سازشیں بختیارک کی فضول حرکتیں، لقا کا
غرور، مہرنگار کی وفا کیشی ملکہ آہیرت کی شوہر پرستی، بہار کی رومانی شخصیت، صرصر کا
عمرو عیار سے مقابلہ مہتر قران کی استاد نوازی غرض کہ یہ سب خصوصیتیں ہر
ایک کو منفرد شخصیت کا مالک بناتی ہیں امیر حمزہ کے دوسرے ساتھی مثلاً
بدیع الزماں، نورالدہر، اسد، ایرج، لندھور بن سعدان وغیرہ سب اپنے اپنے
مخصوص انداز رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ دلچسپ کردار عمرو عیار کو تو کسی طرح بھلا
نہیں جاسکتا یہ کردار عجیب وغریب صفات کا مجموعہ ہے اس کی شخصیت میں
چالاکی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے روپ بھرنے میں کوئی اس کا ثانی نہیں
کوئی وقت کیسی ہی محال کیوں نہ ہو اسے یہ بآسانی سر کر لیتا ہے اس کی زنبیل، اسکی
گلیم اور کمند اس کے خاص ہتھیار ہیں جن سے وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ شرارت اسکی
گھٹی میں پڑی ہے لیکن وہ مردم آزار نہیں سفید جھوٹ بول لینا اس کا خاص فن ہے
لیکن اس کا جھوٹ ایسا نہیں جس سے کسی کو نقصان پہنچے غرضیکہ یہ کردار عجیب وغریب
شخصیت کا مالک ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں میں نے صرف طلسم ہوشربا ہی کے چند کردار گنائے ہیں اور دوسری
داستانوں کے کردار اگر پیش کئے جائیں تو یہ فہرست بہت طویل ہو جائے گی مختصر
یہ کہ ان طلسماتی افسانوں میں طرح طرح کے اور عجیب وغریب ہنگامے موجود ہیں اور
حیرت اور دلچسپی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو یہاں موجود نہ ہو محمد حسین جاہ
جنھوں نے طلسم ہوشربا کی پہلی چار جلدیں تالیف کی ہیں چند اشعار میں اس کا خلاصہ

یوں پیش کیا ہے۔

لکھی جو اے جاہ داستان یہ عجب مزے کی حکایتیں ہیں
کہیں ہے جنگ و جدل کا ساماں کہیں ہے عیاریوں کا چرچا
کسی جگہ پر صفت مکان کی کہیں پہ تعریف شہر کی ہے
کہیں ہے وصف بہار گلشن کہیں بیانِ صفاتِ صحرا
کہیں ہے نیرنگئ طلسمی کہیں ہے اس میں بیان جادو
کہیں پہ آمد ہے لشکروں کی کہیں لڑائی کا ہے سراپا
کہیں ہے جھگڑا جو عاشقوں سے تو نازنینوں کی پیاری باتیں
کہیں سراپا ہے حسن دلبر کہیں ہے میلے کا اس میں جلسہ

یہ اشعار طلسم ہو شربا ہی پر نہیں اردو ادب کے ہر طرح کے طلسماتی افسانوں پر کم و بیش صادق آتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں جب فرار مقصد حیات ہو جائے یا سکون ہی زندگی کا فلسفہ بن جائے تو یہ عقیدہ سخت مضر ہو جاتا ہے پچھلی صدی میں ہماری معاشرتی زندگی میں ایسا ہی کچھ ہوا زندگی فرار میں کٹنے لگی عیش و عشرت مقصد حیات ہو گیا داہمے کو علم کا درجہ دیا جانے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم حقایق زندگی سے بھاگنے لگے یہاں تک کہ ہماری زندگی ان لوگوں کے قبضہ و قدرت میں آگئی جو زندگی کو ایک مسلسل کش مکش سمجھ کر برتتے تھے یعنی جب انگریزوں نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور اپنے علوم و فنون پھیلانا شروع کیے اور ذرائع آمد رفت وسیع کئے اس وقت ہم پر یہ کھلا کہ جسے ہم حقیقت سمجھ رہے تھے

وہ محض سراب تھا نظروں کا طلسم تھا جس کی وقعت کچھ نہ تھی آمد و رفت کی آسانیوں نے بتلایا کہ دنیا تنگ نہیں ہے اور یہ بھی کہ کوہ قاف اور پرستان محض خیالی دنیا کی جنتیں ہیں سائنس کی تعلیم نے بتلایا کہ جسے ہم علم کہتے تھے وہ ظلمت محض تھی علم سیاسیات نے ہدایت کی کہ بادشاہت ایک ایسا طریق حکومت ہے جس میں فرد اور قوم دونوں کو ذہنی اور معاشی ترقی کے مواقع بہم نہیں پہنچتے واقعیت کے اس سمسم نے طلسمی دروازوں کا جادو چشم زدن میں توڑ دیا اور آج یہی وجہ ہے کہ ہم ان کہانیوں کو فضول اور بے سروپا سمجھنے لگے ہیں اب ہم کو ان میں کوئی دلچسپی کا سامان نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ آج ہماری زندگی میں عجلت ہر جگہ کارفرما ہے فرصت کی کمی ہو گئی ہے دنیا کی بیشمار چیزیں ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں ہمیں فرصت نہیں کہ طلسم ہوشربا، طلسم نوراَفشاں یا بوستان خیال وغیرہ جیسی ضخیم جلدوں کو پڑھ سکیں، ضرورت اس بات کی ابھی ہے کہ ان کہانیوں پر نظر ثانی کی جائے ان کو مختصر کیا جائے اور اس طرح ان کا صحیح مقام پیدا کیا جائے۔

اندازِ بیان شبلیؔ، حالیؔ اور آزادؔ

جب بات دل سے نکلے، روح میں رچ کر نکلے تو اسٹائل یا اسلوب بنتا ہے
یعنی جب لکھنے والا اپنا خون جگر، اپنے سچے جذبات بھی اس تحریر میں شامل کر دے
جسے وہ لکھ رہا ہے تو اس تحریر کا لب و لہجہ اور انداز خاص اس کا اپنا انداز ہو جاتا ہے
اور یہ دوسروں سے اسی طرح مختلف ہوتا ہے جیسے اس کی اپنی شکل و صورت ظاہر ہے
کہ یہ چیز نقل یا تقلید سے نہیں آتی اور نہ مشق اور کاوش سے پیدا کی جا سکتی ہے غالبؔ
کے انداز خطوط نویسی کی بہت سی نقلیں کی گئیں آزادؔ کے اسلوب بیان کا چربہ بہت
سے لوگوں نے اتارنا چاہا لیکن اسلوب بیان کا راز تو شخصیت کا راز ہوتا ہے۔ جس
طرح ایک شخص کی طبیعت اور مزاج اور دل و دماغ کی یکسانیت دوسرے میں
نہیں پیدا کی جا سکتی اسی طرح ایک شخص کے اسلوب بیان کی نقل کوئی دوسرا نہیں
اتار سکتا۔ نقل کرنے سے یا سوچ سوچ کر پر تصنع عبارت لکھنے سے آدمی منشی ہو سکتا

ہے ادیب نہیں ہو سکتا انداز بیان یا اسٹائل میں جان اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لکھنے والے کے دل میں کوئی بات لگی ہوتی ہے اپنے موضوع سے اسے دلچسپی ہی نہیں عشق ہوتا ہے یا پھر کسی ایسے سے مخاطب ہوتا ہے جس سے وہ خلوص برتتا ہے اور اپنے دل کو تمام تر کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہے سرسید اور آزاد کے مضامین اور غالب کے خطوط میں ایک جاندار اسلوب بیان اسی لئے ملتا ہے کہ وہ بڑے پر خلوص، بڑی دلچسپی اور بڑے چاؤ سے لکھے گئے ہیں۔ کوئی موضوع ہو محبت اور دلچسپی سے لکھا جائے تو جگ بیتی بھی آپ بیتی بن جاتی ہے اور خلوص اور دلسوزی کے بغیر اگر آپ بیتی بھی لکھی جائے تو وہ واقعات کی ایک کھتونی ہو کر رہ جاتی ہے۔

شبلی کا موضوع عام طور سے جگ بیتی تھا یعنی تاریخ نویسی۔ تاریخ کے موضوعات پر اس طرح لکھنا کہ پڑھنے والے کو قصوں کی طرح دلچسپی پیدا ہو جائے واقعات کا منطقی اور مستند تسلسل برقرار رہے اور ساتھ ہی جس تاریخی شخصیت کی تاریخ لکھی جا رہی ہے اس کی سیرت کی عظمت اور اہمیت بھی برقرار رہے یہ سب بڑے سلیقہ کا کام ہوا کرتا ہے اور جس مورخ میں تحقیق و جستجو کا شوق، صحیح تنقید اور پرکھ کا مادہ، سیرت نگاری کا صحیح سلیقہ اور پھر اپنی قوت استدلال سے ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود نہ ہو تاریخ نگاری کے فرائض سے پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا شبلی کا عام موضوع تو یقینی طور پر تاریخ نویسی ہے۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان اور سیرۃ النبی اسی ذوق تاریخ نویسی کا ثمر پیش رس ہیں لیکن ادب فلسفہ اور مذہب سے بھی انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ ادبیات میں موازنہ انیس و دبیر

اور شعر العجم اور ان کی اردو اور فارسی کی نظمیں ان کے ادبی شوق اور تنقیدی ذوق کی بڑی اچھی مثالیں ہیں فلسفہ اور کلام میں الکلام، علم الکلام الغزالی اور سوانح مولانا روم ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ ایک ایسا شخص جو بیک وقت ادب، فلسفہ، شاعری، تاریخ، سیاست اور مذہب سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہو اور پھر شاعر بھی ہو، ظاہر ہے کہ اس کی تحریروں میں کیا کچھ حسن، وزن اور وقار نہ ہوگا۔

تاریخی اور تحقیقی مضامین اگر سنجیدگی اور متانت کے ساتھ نہ لکھے گئے ہوں تو ان کا بھرم باقی نہیں رہتا ان میں منطقی استدلال نہ ہو، یا بحث کا سلسلہ نہ قائم رکھا جائے یا نتیجے میں کوئی اچھی تلی رائے نہ پیش کی جائے تو مضمون ادھورا سا معلوم ہوتا ہے شبلی فلسفہ اور تاریخ نویسی کے اس گر سے بخوبی واقف تھے خود وکالت کی تعلیم بھی حاصل کر چکے تھے اسی لئے وہ کسی بات کو پوری طرح ثابت کئے بغیر نہ چھوڑتے تھے۔ سیرۃ النبی کی ایک عبارت ملاحظہ کیجئے۔

"عالم کائنات کا سب سے مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے یعنی پہلے ہر قسم کے فضائل نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں پھر تمام عالم میں ان کی علمی تعلیم رائج کی جائے اسی مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر تمامی ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن

اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں ـــــ یہ طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن سب سے زیادہ صحیح سب سے زیادہ کامل سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں نہ جبر و زور سے کام لیا جائے بلکہ فضائل اخلاق کا ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے جس کا ایک ایک اشارہ او امر سلطانی بن جائے "۔

شبلی کی یہ سنجیدہ شستہ اور باوقار عبارت کبھی کبھی زورِ بیان کے باعث رنگین بھی بن جاتی ہے شعر العجم اور ان کے مکاتیب میں ایسے مواقع اکثر آئے ہیں اور وہ جب کبھی آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کا ایک سیلاب ہے جو تمام بندشوں کو توڑ کر زور و شور سے بہنے لگا ہے پیغمبر کی ولادت باسعادت کا ذکر انھیں کی زبانی سنئے :-

" آج کی صبح وہی صبح جانواز، وہی ساعت ہمایوں وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان و زبان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکتِ روم اوجِ چین، کے قصرہائے فلک بوس

گر پڑے آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدۂ کفر، آذر کدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں مل گئے شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے توحید کا غلغلہ اٹھا چمنستان سعادت میں بہار آ گئی آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔"

شبلی کی تصنیف میں کوئی مضمون ایسا نہ ملے گا جس میں صفائی اور شستگی کے علاوہ ادبیت کا رنگ نہ ملے یہ رنگ کبھی ہلکا ہوتا ہے کبھی گہرا اور باوجود ایک مولوی ہونے کے عربی و فارسی کے ثقیل اور نامانوس لفظوں اور نامانوس ترکیبوں سے پرہیز کرتے ہیں اور اپنے معاصرین سرسید اور حالی کی طرح انگریزی زبان سے مرعوب ہو کر انگریزی کے الفاظ خواہ مخواہ نہیں لاتے۔

محمد حسین آزاد کا مزاج اور ان کا اسلوب بیان شبلی سے بالکل جداگانہ ہے تاریخی اعتبار سے ان کا ذکر شبلی سے پہلے آنا چاہیے کیونکہ شبلی سے یہ کوئی پچیس برس بڑے تھے غدر سے بہت پہلے ۱۸۳۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ان کے زمانہ میں فارسی کا چرچا بالکل مٹا نہ تھا کم البتہ ہو گیا تھا فارسی زبان اور فارسی شاعری سے آزاد کو بیحد دلچسپی تھی شاعری میں استاد ذوق کے شاگرد تھے تفصیل علم اور تحقیق کرنے کا بڑا شوق تھا سب سے پہلے اردو زبان کی مستند تاریخ اور اردو زبان کے شعراء کے مفصل حالات اور ان کے کلام پر مفصل تنقید جس شخص کے قلم سے اردو زبان میں نکلی وہ آزاد ہی کی شخصیت تھی اس کتاب کا نام آب حیات

ہے جو ۱۸۸۰ء میں شایع ہوئی تھی تمثیلی انداز کے مضامین بھی نیرنگ خیال کے نام سے سب سے پہلے آزاد ہی نے اردو میں پیش کیے آزاد کی دو تصنیفیں اور بہت مشہور ہوئیں ایک تو دربار اکبری دوسری سخندان فارس۔ دربار اکبری میں اکبر بادشاہ کے ذاتی حالات اس کی حکومت کے آئینی حالات اور اس کے دربار کے تمام مشہور وزیروں، امیروں اور عالموں کے سوانح حیات بڑی محنت سے جمع کیے ہیں اور بہت مفصل لکھے ہیں۔ سخندان فارس کے ۲ حصے ہیں پہلے حصے میں فارسی زبان کی اصلیت اور ساخت کو بیان کیا ہے دوسرے حصے میں فارسی زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان کتابوں کے علاوہ آزاد کی اور بھی بہت سی تصانیف ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور یہی ہیں آزاد کی ان تمام تصانیف میں جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ اور نمایاں نظر آتی ہیں وہ ان کا انداز بیان ہے وہ چاہے تحقیقی مضامین (جیسے اردو یا فارسی زبان کی تاریخ) لکھ رہے ہوں چاہے تاریخی مضامین مثلاً دربار اکبری کے واقعات یا اردو شاعری کے حالات لکھ رہے ہوں ان کا دلکش اور شاعرانہ انداز بیان ہر جگہ دل کو بھاتا نظر آتا ہے دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔ سخندان فارس کے حصہ اول میں لفظوں کی ولادت و نسل اور ان کی نوعیت اور ساخت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میرے دوستو تم حیران ہو گے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جزو جزو کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے ان میں کیا رشتے ہیں اور کیونکر

وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں مثلاً لفظ گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا
بان پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گرے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی گلو
پایا سمجھ گیا کہ اس جزو لباس کا گلے پر قبضہ ہے اس لئے اس کا نام
گریبان رکھا ہو گا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوان ہی
معنوں میں آیا ہے اور بان سنسکرت میں وان ہے ثابت ہو گیا کہ ایک
گھرانے کی نسل ہے ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی یہاں مر گیا
وہاں جیتا ہے"۔

آزاد نے آب حیات میں اپنے استاد ذوق کا حال بہت تفصیل سے یعنی کوئی
ساٹھ صفحات میں لکھا ہے ان کے ساتھ آزاد کو بے انتہا محبت اور عقیدت ہے
اسی لئے دیکھئے کس انداز سے ان کا حال شروع کرتے ہیں۔

"ملک الشعراء خاقانیِ ہند شیخ ابراہیم ذوق جب وہ صاحب
کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں
نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا جن کی خوشبو شہرت عام بن کر
جہاں میں پھیلی اور رنگ بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی
وہ تاج سر پہ رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو
کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں
ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا
خاتمہ کیا گیا"۔

انداز بیان کے لحاظ سے ان کی سب سے مشہور کتاب نیرنگ خیال ہے اور

حقیقت یہ ہے کہ آزاد اگر کوئی اور کتاب نہ لکھتے تو صرف یہی کتاب ان کے انداز بیان کو مشہور کرنے کے لئے کافی تھی اس میں چند تمثیلی مضامین پیش کئے گئے ہیں جنھیں انگریزی میں (ALLE-GORICALESSAYS) کہتے ہیں بعض مضامین میں بڑی جدت اور ندرت سے کام لیا گیا ہے خصوصاً اس مضمون میں جس کا عنوان ہے "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" یا ایک دوسرا مضمون جس کا عنوان ہے "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" اس دوسرے مضمون میں تاریخ عالم کی اکثر مشہور ہستیوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا ہے چنانچہ کالیداس، فردوسی، چنگیز خاں۔ امیر تیمور بو علی سینا اکبر، جہانگیر، شیواجی مرزا سودا۔ ناسخ۔ آتش۔ ذوق۔ غالب وغیرہ کو ایک فرضی دربار میں قرینے سے کرسیاں دی گئی ہیں۔ کالیداس کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیر باد کہی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا جس میں ہیرے اور پنے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے معلوم ہوا کہ وہ راجہ بھوج تھے اور ۳۲ پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالیداس شاعر تھا جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے"

آزاد کا یہی انداز بیان ہے جو اردو ادب میں اپنی منفرد حیثیت رکھتا ہے آزاد کی تحقیق و تنقید سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے لیکن ان کا اسلوب بیان ہر نقاد نے سراہا ہے ان کے انداز بیان کی بہت سے لوگوں نے نقل بھی کرنا چاہی لیکن

بات بن نہ پڑی اس لئے کہ ان کا اسلوب پیدا کرنے کے لئے ان کی سی طبیعت ہونا چاہیئے ان کی طبیعت میں نازک خیالی، لطافت اور موزونیت خداداد تھی۔ حقیقت نگاری کے ساتھ رنگینی و پرکاری ہر ایک شخص کے بس کی بات نہیں ان کی نثر میں وہ شاعرانہ آب و تاب ہے کہ نظم کا لطف آتا ہے۔

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالیؔ کا انداز بیان آزاد کے اسلوب بیان کے بالکل متضاد ہے جس طرح آزاد کے یہاں عام طور پر رنگین افسانویت اور خیالی سحر کاریاں ملتی ہیں حالیؔ اپنے مضامین اس قدر صاف سیدھے اور نیچرل انداز میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات بالکل سپاٹ ہو جاتے ہیں ان کے یہاں خیال کی رنگینیوں اور جذبات کی گرماگرمی کے بجائے صرف عقل ہی عقل ہے اور جذبات میں بھی اس قدر گہرائی ہے کہ بادی النظر میں ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا حالانکہ حالیؔ دل کے بہت حساس بڑے ہمدرد اور پر خلوص انسان تھے لیکن ساتھ ہی مزاج میں سادگی انتہا کی تھی۔ اور یہی سادگی ان کی انشا پردازی پر جگہ چھائی ہوئی ہے بعض اوقات تو ہنگامی موقع بھی ایسے بے لاگ اور سادہ طریقے سے ادا کر دیے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہے مثلاً غدر ۵۷ء کا انقلاب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن اپنی تصنیفات میں جب کبھی غدر کے حالات پر کچھ لکھنے کا موقع آیا ہے تو اسے سرسری طور پر لکھ دیا ہے جیسے معمولی واقعہ ہو حالیؔ نے یوں تو بہت سی کتابیں لکھیں لیکن نثر میں ان کی چار تصنیفیں بہت مشہور ہوئیں پہلی حیات سعدی ہے جو غالباً اردو میں سیرت نگاری پر سب سے پہلی کتاب ہے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ دوسری یادگار غالب ہے جس میں انھوں نے اپنے

استاد غالب دہلوی کی زندگی کا حال لکھا ہے اور ان کی اردو و فارسی شاعری کا تعارف کرایا ہے کہا جاتا ہے کہ ان کی یہی کتاب تھی جس نے غالب کو عوام و خواص سب میں مقبول کر دیا تیسری کتاب حیات جاوید سرسید کی مفصل سوانح عمری ہے اور جس محنت و محبت سے اسے ترتیب دیا گیا ہے اس کی مثالیں اردو زبان میں کم ہی ملیں گی۔ ان تاریخی یا سوانحی کتابوں کے علاوہ سب سے زیادہ مشہور ان کا وہ معرکہ آرا مقدمہ ہے جسے انھوں نے اپنے دیوان کے ساتھ ۱۸۹۲ء میں شامل کیا تھا اور جو اب مقدمۂ شعر و شاعری کے نام سے معروف ہے یہ پہلی کتاب تھی جو شعر و ادب کی تنقید پر لکھی گئی اور اس کا اثر اردو شاعری پر اس قدر زیادہ ہوا کہ اس نے اردو شاعری کا انداز ہی بالکل بدل دیا۔

میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ان کا مزاج بہت سادہ اور بیجا تصنع سے بالکل بری تھا یہی سادگی ہے جو ان کے اسلوب بیان میں ہم کو ہر جگہ اور ہمہ وقت ملتی ہے سیدھی سیدھی سچی باتیں ہیں جو بالکل سادہ اور صاف انداز میں بیان کر دی گئی ہیں اسی لئے بعض ناقدین کی رائے ہے کہ ان کی عبارت پڑھنے سے کوئی ادبی مسرت نہیں حاصل ہوتی اس لئے حالی کو کوئی خاص صاحب طرز نہیں کہہ سکتے صحیح اور با اصول ادیب ضرور ہیں لیکن عرض یہ ہے کہ بیان کی صداقت اور دلائل کی قوت میں خود ایک حسن ہوتا ہے جو شدت سے متاثر کرتا ہے اور جس کی عبارت متاثر کرے اسے آپ صاحب طرز کہے بغیر نہیں رہ سکتے یہاں حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری سے ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے اس سے آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ حالی کی سیدھی سچی باتیں، باوجود سیدھی سادی ہونے کے کچھ اثر رکھتی ہیں یا نہیں یہ بھی دیکھئے

کہ جگہ جگہ ہندی کے عام الفاظ کس سلیقہ سے کھپائے ہیں یہاں اردو غزل پر اعتراض یہ کہکر پیش کر رہے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی غزل کے موضوعات میں بھی تبدیلی کر لینا چاہیئے۔ اس کو وہ یوں لکھتے ہیں۔

"دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ بستی جاتی ہیں یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کر کے رہ جائے گی بلکہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ ارض پر پانی پھرتا نظر آتا ہے اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح و شام ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کسی واقعہ کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا کسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں اس سے زیادہ دلچسپ میٹیریل غزل کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے ہر بات کا ایک محل اور ہر کام ایک وقت ہوتا ہے عشق اور عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں اب وہ وقت گیا عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی اب کالنگڑے اور بھاگ کا وقت نہیں رہا اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے"!

آپ نے دیکھا؟ اسے کہتے ہیں سادگی و پرکاری حالی کے صاحب طرز ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے؟

البتہ ایک بات حالی کی تحریر میں بُری طرح کھٹکتی ہے وہ ہے بعض انگریزی الفاظ کا خواہ مخواہ اور بے جا استعمال یہ بدعت سرسید کی تقلید میں حالی اور بعض ، ادیبوں نے اس وقت اختیار کی تھی اس خیال سے کہ اس طرح ہم اردو میں نئے الفاظ رواج دے کر اس کو تہی دامن رہنے سے بچالیں گے ان بزرگوں کی نیت کی درستی میں شک نہیں ہے اور اگر وہ ایسے انگریزی الفاظ ہماری زبان میں داخل کرتے جن کا بدل ہمارے یہاں نہیں ہے تو یقیناً یہ اردو کی اچھی خدمت ہوتی ہیں لیکن ایسے الفاظ شامل کرنا جن کے ہم معنی الفاظ ہمارے یہاں موجود ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا مثلاً پولٹیکل ، مورل ، سویلیزیشن ، مٹیریل ، سوپر نیچرل ، اسٹرگل سلف ہلپ کے بجائے وہ آسانی سے ان کے مرادف الفاظ لا سکتے تھے لیکن یہ انھوں نے نہیں کیا ۔ انگریزی زبان وادب سے یہ بیجا مرعوبیت ضرور ناگوار ہوتی ہے ۔

استادوں کی اصلاحیں

کسی خیال، کسی جذبے، یا کسی حقیقت کو جب ایسے انداز سے بیان کیا جائے
کہ وہ بہت حسین، بہت خوبصورت معلوم ہو، دل کو موہ لے اور قلب کو گرما دے تو
ایسے کلام کو شاعری کہتے ہیں یہ الفاظ دیگر انداز بیان ہی میں شاعری کی جادوگری
کا راز پنہاں ہے جادوگری اور سحر کاری کی یہ صلاحیت شاعر کو فطرت کی طرف سے
عطا ہوتی ہے اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی لیکن اس میں شک نہیں کہ اس صلاحیت پر جلا ہوتی
ہے بہت کچھ اس کے مطالعے اور مشاہدے سے یا پھر کسی باکمال کے سامنے زانوئے
شاگردی تہہ کرنے سے فطری صلاحیت کو بھی جب تک ٹھیک تربیت نہ دی جائے
اسے پختہ اور مستند بننے میں بڑی دیر لگتی ہے اور بڑی دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں خصوصاً
فنون لطیفہ کے ابتدائی مدارج کی تعلیم میں تو ایک رہبر، ایک خضرِ راہ کی بہت ضرورت
ہوتی ہے اسی لیے ہماری پرانی تہذیب نے شعر و شاعری کے فن میں بھی استادی اور

شاگردی کا طریقہ جاری کیا تھا جس کے باعث ایک نو آموز لیکن شاعرانہ صلاحیتیں رکھنے والا شخص بہت جلد اور بہ آسانی شاعری کے فن میں طاق ہو سکتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو اپنے استاد سے بھی بڑھ جاتا تھا سودا کی مثال سامنے ہے یہ شیخ حاتم کے شاگرد تھے لیکن بعد میں خود اتنے بڑے شاعر ہو گئے کہ حاتم ان کی شاگردی پر فخر کرنے لگے تھے۔

لیکن استادی اور شاگردی کے سلسلہ میں یہ بات نہ بھولنا چاہیئے کہ کوئی استاد، وہ چاہے کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو کسی ناشاعر کو شاعر نہیں بنا سکتا اور اسی لئے آج کل کے بہت سے نقاد اس سلسلے کو ختم ہی کر دینا چاہتے ہیں، حالی نے بھی اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا تھا کہ "ہمارے ملک میں جو شاعری کے لئے ایک استاد قرار دینے کا دستور اور اصلاح کے لئے ہمیشہ اس کو اپنا کلام دکھانے کا قاعدہ قدیم سے چلا آتا ہے اس سے شاگردوں کے حق میں کوئی معتد بہ فائدہ مترتب ہونے کی امید نہیں ہے استاد شاگرد کے کلام میں اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہے کہ کوئی گریمر کی غلطی بتا دے یا کسی عروضی لغزش کی اصلاح کر دے لیکن اس سے نفس شعر میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی"۔ حالی کا یہ ارشاد اپنی جگہ بالعموم درست ہے لیکن ہر شاگرد اور ہر استاد کے بارے میں یہ صحیح نہیں کہا جا سکتا اسی طرح ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "شاعر بننے کے لئے سب سے اول سبق استعداد، پھر نیچر کا مطالعہ اور اس کے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور ان کے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا اور اگر میسر آئے تو ان لوگوں کی صحبت سے مستفید ہونا جو شعر کا صحیح مذاق رکھتے ہوں"۔ تو یہاں بھی حالی کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے

اول تو کثرت سے اساتذہ کے کلام دیکھنے کا موقع اور فرصت آجکل کہاں اور دوسرے اساتذہ کی صحبت مشکل ہی سے میسر آتی ہے اور کوئی اس کی کاوش بھی کرے تو وقت زیادہ درکار ہے اور دقتیں راہ میں بہت ہیں اس لئے کسی ماہر استاد کا میسر آجانا نسبتاً آسان اور مفید تر ہے جس طرح کوئی طالب علم چاہے جتنا محنتی اور ذہین، کیوں نہ ہو اس کے لئے بھی بالخصوص ابتدائی مدارج میں ایک معلم کی ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ اس صورت سے وہ بآسانی اور جلد تر ان منزلوں پر پہونچ جاتا ہے جہاں محنت اور شوق کے بل بوتے پر پہونچتا بھی تو بڑی مشکلوں کے بعد اور بڑی دیر میں، اسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فن ہو جائے استاد خالی ہی رہتی ہے اور شاعری میں تو خاص کر ایک شفیق اور ہوشیار استاد کی بڑی ضرورت ہے کیونکہ بقول آتش ؎

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصّع ساز کا

اس میں شک نہیں کہ شعر میں حسن پیدا کرنا بڑے آرٹ کا کام ہے ایک ایک لفظ اپنے معنی اور آواز دونوں کے لحاظ سے قدر و قیمت رکھتا ہے، حسب حال صحیح لفظ بٹھانا بڑی مشق اور محنت کے بعد آتا ہے بعض اوقات محض لفظوں کے الٹ پھیر سے شعر کے معنی یا اثر میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے، کسی نے خوب کہا ہے ؎

لفظیکہ تازہ است بہ مضمون برابر است

اس نکتے کو ہمارے پرانے استاد خوب جانتے تھے اپنے شاگردوں کے کلام پر جیسی اصلاحیں انھوں نے دی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی نشست میں وہ کسقدر

ماہر تھے، ہر لفظ کے مزاج اور اس کی کیفیت سے وہ پوری طرح باخبر ہوتے تھے۔
میر دوست علی خلیل، آتش لکھنوی کے مشہور شاگردوں میں سے تھے ایک مشاعرے میں بغیر اصلاح کے غزل پڑھی اور معلوم ہوا کہ غزل بہت کامیاب رہی دوسرے دن استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے فخر سے بتایا کہ کل مشاعرے میں میری غزل بہت کامیاب رہی یہ کہہ کر غزل سنانے لگے مطلع تھا ؎

مدت کے بعد آج وہ اے مہرباں ملے
دل کی کہوں جو جان کی مجھ کو اماں ملے

سنتے ہی آتش نے منہ بنا کر کہا "جو جان" کس کا نام ہے؟ پھر اصلاح دی ؎

مدت کے بعد آج وہ اے مہرباں ملے
دل کی کہوں گا جان کی مجھ کو اماں ملے

جو جان، میں تنافر حرفی تھا، کہوں گا، کے فقرہ سے یہ عیب دور ہو گیا۔
اسی طرح روایت ہے کہ لکھنؤ کے ایک معرکۃ الآرا مشاعرے میں حسن اتفاق سے آتش و ناسخ مع اپنے شاگردوں کے تشریف لائے، آتش کے استاد میاں مصحفی سے بھی وعدہ تھا وہ ابھی مشاعرے میں آئے نہ تھے، مشاعرہ شروع ہو گیا ایک نو مشق کمسن لڑکے نے ایک مطلع پڑھا ؎

حبس کم سخن سے میں کروں تقریر بول اٹھے
مجھ میں کمال وہ ہے کہ تصویر بول اٹھے

اس مطلع پر مشاعرے کی چھتیں اڑ گئیں اور ناسخ نے کئی بار اس مطلع کو پڑھوایا اور اس لڑکے کی خلاف معمول بے حد داد دی اسکے پڑھنے کے بعد مشاعرے میں میاں

بھی تشریف لائے اہل بزم تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور صدر میں ان کو جگہ دیگئی
خ ناسخ نے اپنے دل میں ارادہ کیا کہ جب استاد مصحفی کی باری آئے تو میں انکو نیچا دکھاؤں
انچہ سب کے آخر میں جب شمع گردش کرتی ہوئی ان کے سامنے آئی تو ناسخ نے کہا
ناؤ آپ کے تشریف لانے کے قبل (لڑکے کی طرف اشارہ کرکے) اس لڑکے نے ایسا
ل مطلع پڑھا جس کی تشریف میں زبان قاصر ہے مصحفی نے کہا وہاں پڑھا ہوگا، کہا
ری خواہش ہے کہ آپ بھی سن لیں یہ کہہ کر اشارہ کیا اور ان کے ایک شاگرد نے مصحفی
کے آگے سے شمع اٹھا کر لڑکے کے سامنے رکھدی اور لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا میاں
اپنا مطلع استاد کو بھی سنادو اس نے پھر وہی مطلع پڑھا آتش اپنے استاد کے آگے
ے شمع اٹھوا لینے پر آگ ہو گئے اور ناسخ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ایک غلط مطلع
س قدر ناز کیا جاتا ہے بالتصویر کا کلام سخن ہونا دور از قیاس ہے اسی وقت اصلاح
ر لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا کہ میاں اسے یوں پڑھو ؎

جس بے زباں سے میں کروں تقریر بول اٹھے
مجھ میں کمال وہ ہے کہ تصویر بول اٹھے

تش کی یہ جودت طبع دیکھ کر میاں مصحفی خوش ہو گئے اور شیخ ناسخ خاموش ہو گئے واقعی
البدیہ ایسی اصلاح دینا آتش ہی، ایسے استاد کا حصہ تھا۔ (از مشاطۂ سخن)

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ فتح الدولہ برق لکھنوی جو ناسخ کے ارشد تلامذہ میں
ے تھے اور جن کا کلام اصلاح سے مستغنی ہو چکا تھا، ان کی ایک غزل مشاعرہ میں
ت مقبول ہوئی لیکن جب ناسخ کو سنانے آئے اور یہ شعر پڑھا ؎

اس گل نے ایک رات جو پہنا تو بس گیا
بوئے گلاب آئی ہے موتی کے ہار میں

ناسخ نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ گلاب کے پھولوں کا ہار سوائے ان لوگوں کے جو کسی مندر یا مٹھ کے پجاری ہوں کوئی اور نہیں پہنتا میں نے تو کسی شریف آدمی کو گلاب کے پھولوں کا ہار پہنتے نہیں دیکھا اس کے بعد فرمایا کہ سامنے کی بات ہے دوسرے مصرع کو یوں بنا دو

بو موتیے کی آتی ہے موتی کے ہار میں

اسی طرح کی بہت سی اصلاحیں مشہور ہیں منشی امیر مینائی کا ایک شعر تھا ؎

غضب داغ توتے دیے لے فلک کلیجہ گلِ نیلو فر ہو گیا!

ان کے استاد اسیر لکھنوی نے اصلاح دی۔

غضب چٹکیاں ہیں تری اے فلک کلیجہ گلِ نیلو فر ہو گیا

امیر مینائی کے پہلے مصرع میں کلیجے کے گلِ نیلو فر ہونے کا کوئی ظاہری ثبوت نہ تھا، چٹکیاں لینے سے کلیجے کا گلِ نیلو فر ہو جانا بالکل ثابت ہو گیا۔ مومن کے کسی شاگرد کا ایک مطلع تھا ؎

ہجر میں کیوں کر پھرے دل ہر سو نہ گھبرایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

انھوں نے اصلاح دی ؎

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

پہلا مصرعہ بدلنے سے واقعیت کے اظہار میں کس قدر اثر پیدا ہو گیا۔

حالی کا ایک شعر تھا ؎

عمر شاید نہ کرے آج وفا سامنا ہے شبِ تنہائی کا

استاد غالب نے اصلاح دی ؎

عمر شاید نہ کرے آج وفا　　　　کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

ظاہر ہے کہ اس موقع پر لفظ کاٹنا ہی زیادہ پر لطف و معنی خیز ہے کیونکہ یہ لفظ عمر اور شب دونوں میں مشترک ہے ایک لفظ کے بدل جانے سے خوبی بڑھ گئی ایک مرتبہ حضرت ریاضؔ خیر آبادی سے راجہ صاحب محمود آباد نے کہا کہ آپ کلام اصلاح سے مستغنی ہے ریاضؔ نے کہا کہ نہیں، ابھی ایسا نہیں ہوا پھر اپنا ایک شعر سنایا ؎

نسیم آئی ہے شمع مزار گل کرنے　　　　وہ اسکے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہوگی

اور کہا کہ دیکھئے استاد امیرؔ مینائی نے اس پر صرف ایک لفظ بڑھا دیا، بحر میں کوئی فرق نہیں آیا اور شعر کا اثر بڑھ گیا، راجہ صاحب نے پوچھا وہ کیونکر، کہا پہلا مصرع یوں کر دیا ؎

نسیم اب آئی ہے شمع مزار گل کرنے
وہ اس کے آنے سے پہلے ہی بجھ گئی ہوگی

ایک دلچسپ واقعہ داغؔ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب ان کے مشہور شاگرد جناب احسنؔ مارہروی نے اپنا یہ شعر بغرض اصلاح ان کے پاس بھیجا ؎

خدا پرسش کرے گا حشر میں ساری خدائی سے
بھلائی کی بھلائی سے برائی کی برائی سے

تو داغؔ مرحوم نے یہ لطیف جملہ لکھ کر واپس کر دیا کہ آپ غزل کہہ رہے ہیں یا وعظ؟ غرض اس قسم کی اصلاحوں کے سیکڑوں واقعات مشہور ہیں۔

مگر یہاں تک تو آپ نے دیکھا کہ استادوں نے ایک ایک شعر کو کیونکر بنایا اور ایک ایک لفظ کے الٹ پھیر سے کیونکر شعر میں جان ڈال دی لیکن اب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ایک ہی شعر کو مختلف اساتذہ کس طرح بناتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ کام بہت

مشکل تھا کہ مختلف اساتذہ ایک ہی شعر کو بنانے کے لئے اتنی زحمت برداشت کرتے!
لیکن جناب شوقؔ سندیلوی صاحب نے یہ گتھی سلجھا دی اور کوئی بیس بائیس استادوں
کے بیک وقت شاگرد ہو گئے اور ہوشیاری یہ کی کہ کسی استاد پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ
وہ کسی اور کے بھی شاگرد ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی پندرہ سولہ غزلوں پر مختلف
الاصول استادوں سے مختلف اصلاحیں بیک وقت حاصل کرلیں اور اصلاحوں کے اس
مجموعہ کو "اصلاح سخن" کے نام سے شایع کر دیا ان کے استادوں میں احسنؔ مارہروی، آرزوؔ
لکھنوی علامہ اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی، حسرتؔ موہانی، ثاقبؔ کانپوری، جلیلؔ، ریاضؔ،
سائلؔ دہلوی، صفیؔ، عزیزؔ، مضطرؔ خیرآبادی، نوحؔ ناروی، نیازؔ فتحپوری، وحشتؔ
کلکتوی غرضیکہ شروع بیسویں صدی کے تقریباً جملہ استادانِ فن شامل ہیں، یہاں
میں صرف ایک شعر پر مختلف اساتذہ کی اصلاحیں سناتا ہوں جناب شوقؔ سندیلوی کا
ایک شعر ہے ؎

سادگی میں یہ کہاں لطفِ خلشِ دل کو نصیب
خط بھی وہ خط ہے اگر شوخیٔ تحریر نہ ہو

احسنؔ مارہروی نے دوسرا مصرع یوں بنایا۔

خط وہ کیا خط ہے اگر شوخیٔ تحریر نہ ہو

آرزوؔ لکھنوی نے لکھا کہ یہ نہیں پایا جاتا کہ خط کس کا ہے اس لئے شعر کو اس طرح
درست کیا ہے۔

چھپتے فقیروں ہی میں ہے شانِ مزاجِ معشوق
خط کوئی خط ہے اگر شوخیٔ تحریر نہ ہو

بیخود دہلوی نے یوں اصلاح دی ؎

سادگی میں بھی ہو لطفِ خلش دل کو نصیب
ان کا خط ہے، نہ سہی شوخیٔ تحریر نہ ہو

بیخود موہانی نے اس طرح درستی کی۔

ایک اک لفظ کلیجے میں چبھا جاتا ہے
خط میں خط ہے کوئی گر شوخیٔ تحریر نہ ہو

ریاض خیرآبادی نے دوسرا مصرع یوں بنایا۔

خط کوئی خط ہے اگر شوخیٔ تحریر نہ ہو

سائل دہلوی نے اس طرح اصلاح دی۔

سادگی میں یہ کہاں لطفِ خلش سمجھو تو
دل نہ بے چین ہو گر شوخیٔ تحریر نہ ہو

شاد عظیم آبادی نے اس طرح بنایا۔

سچ ہے بے لطف وہ فقرے وہ عبارت پھیکی
کچھ بھی نامے میں اگر شوخیٔ تحریر نہ ہو

نوح ناروی نے پورا شعر یوں بدل دیا۔

کیا ہے تقریر نہ ہو کچھ بھی اگر حسنِ کلام
کیا ہے تحریر اگر شوخیٔ تحریر نہ ہو

ناطق لکھنوی، وحشت کلکتوی نے یہ شعر بالکل قلم زد کر دیا، جلیل، صفی، عزیز نے اس شعر کو بالکل صحیح قرار دیا۔

ان تمام مثالوں سے ثابت ہوگیا کہ استادان فن دلفریبی کلام میں کس قدر کاوش کیا کرتے تھے آج استادی اور شاگردی کا طریقہ ختم ہو رہا ہے اس کا بدل تو یہی ہو سکتا ہے کہ انداز بیان کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے پھر خود شاعر ہی کدو کاوش کرے لیکن یہ کام آسان نہیں ہے اور اس سے ہر شاعر بآسانی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں محنت کی بہت ضرورت ہے اس کے لئے چاہیئے کہ اساتذہ کا کلام پیش نظر رکھے ان کے انداز بیان پر غور کرے، ایک ایک لفظ کے اثر سے باخبر رہے اور اس کے ساتھ زمانہ اور انسانی فطرت کا بغور مطالعہ کرتا رہے یعنی وہ تمام باتیں جو پہلے ایک شفیق استاد کیا کرتا تھا اب خود کرے اور تحصیل فن میں اپنی تعلیم و تربیت کا نگراں خود بنے تب اسکے کلام میں استادانہ رنگ پیدا ہو سکتا ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا کہ یہ کام بہت مشکل ہے اور ہر شاعر اسے بآسانی نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ باعتبار فن آجکل کے بہت سے شاعروں میں ہمیں وہ پختگی نہیں نظر آتی جو گذشتہ زمانہ کے استادوں میں ملتی تھی اور یہی باعث ہے کہ پختہ اور ٹکسالی انداز بیان اب ہمارے شاعروں میں رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

ظریف لکھنوی

ہنسنا اور ہنسانا محض ایک فن ہی نہیں بڑا نازک فن ہے اور بڑی ذہانت
ی سوجھ بوجھ اور بڑا رکھ رکھاؤ چاہتا ہے اس فن میں نزاکت یہ ہے کہ ذرا جادۂ
قتدال سے قدم بھٹکا اور فحش اور پھکڑ کے دلدل میں پھنس گئے جس سے صحیح سلامت
ل آنا کارے دارد یعنی بعض اوقات کسی ظریف کے مزاج میں اک ذرا سی گرمی آگئی
گالیاں اور فحشیات، مبتذل طعنوں اور تعریضوں کے دروازے فوراً اس کی طبیعت
کھلنے لگتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ہمارے بہت سے مزاح نگار
نے توسن خیال کو سنبھال نہیں پائے ہیں اور ایسی ایسی باتیں زبان سے نکال گئے ہیں کہ
اب ان کا ذکر کرتے بھی حیا آتی ہے لیکن یہاں ایک ایسے مزاحیہ شاعر کا ذکر ہے
س کے یہاں حد درجہ کی ظرافت کے باوجود کہیں قدم جادۂ اعتدال سے بھٹکا نہیں
ہے جس کے یہاں رکیک اور مبتذل خیالات یا الفاظ آپ کو ڈھونڈھے نہ ملیں گے

جس کا دل اپنے ہم قوموں کی خامیوں ان کی حماقتوں سے اس قدر کڑھتا ہے کہ غصہ
آنے لگتا ہے لیکن زبان دشنام سے آلودہ نہیں ہوتی کڑوی کونین جیسی باتوں کو
بھی شکر آمیز کر دیتا ہے اور ہنسی ہنسی میں وہ پتے کی کہہ جاتا ہے جو سنجیدہ حضرات
یا تو اس قدر صاف صاف کہتے جھجکتے اور اگر کہہ بھی جاتے تو اس کا اتنا اثر نہ ہوتا
یہ ہے شانِ نزول ہمارے اس مقبول و معروف شاعر کی جو ظریف لکھنوی کے نام
سے مشہور رہیں۔ زندہ دلانِ لکھنؤ جہاں تمام دیگر فنون لطیفہ میں کسی سے پیچھے نہیں
رہے وہاں اس فن مزاح نگاری میں کیوں کسی سے کم رہتے ہر زمانے کا مذاق بدلتا رہتا ہے
مزاح نگاری کے طور طریقے بھی بدل گئے ہیں سودا اور انشاء کے زمانے میں ظرافت اکثر و بیشتر مخرب
اور مبتذل قسم کے مضامین سے آلودہ ہو جایا کرتی تھی اور اس کو اس زمانے میں ہجو نگاری
کھکر انگیز کر لیا جاتا تھا گویا اسے ہجو کہہ دینے سے اسکی نوعیت محدود اور محصور ہو جاتی تھی
ظریف مرحوم اس طرح کے وہ فتنے نہیں تھے کہ ایک وقت تو نہایت سنجیدہ اور متین کلام پیش
کریں اور دوسرے موقع پر رکاکت کے اس گرے ہوئے درجہ پر اتر آئیں کہ شرم کو خود شرم
آنے لگے ظریف صرف مزاح نگار تھے وہ سنجیدہ شاعری اگر چاہتے تو بہ آسانی کر سکتے
تھے کیوں کہ زبان پر غیر معمولی قدرت تھی لیکن انھوں نے اپنے لئے صرف ظرافت کا
میدان انتخاب کیا اور کبھی اس دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھا۔

ابھی ۱۹۳۷ء میں ظریف لکھنوی کا انتقال ہوا ہے یعنی دنیا سے گئے انھیں
ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے اور ان کے جاننے والے لوگ بہت سے موجود ہیں اس لئے
ان کی زندگی کا مفصل حال بیان کرنا مناسب نہیں مختصر حال یہ ہے کہ مقبول حسین ظریف
۱۸۷۰ء میں لکھنؤ کے ایک عالم فاضل مگر زندہ دل گھرانے میں پیدا ہوئے ابتدائی

اُردو، عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر اپنے مشہور بھائی مولانا صفیؔ لکھنوی کی نگرانی میں ہوئی اس کے بعد بقدر ضرورت انگریزی بھی پڑھی تھی شعر و شاعری کا ذوق اور اس کی تربیت بھی صفیؔ مرحوم کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی جب کلام میں پختگی پیدا ہو گئی تو باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کی چنانچہ ۱۸۹۹ء میں لکھنؤ میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا طرح یہ تھی ؎

تمنا ہے کسی کی تیغ ہو اور اپنی گردن ہو

ظریفؔ مرحوم نے سب سے پہلے اسی مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی شروع میں ایک قطعہ پڑھا جس میں انھوں نے واضح کیا کہ میں نے ظرافت کا رنگ اس لئے اختیار کیا ہے کہ سنجیدہ مضامین میں سخن سرائی کرنا اور اس میں کامل ہونا بہت مشکل کام ہے اس لئے میں ظرافت کی روش اختیار کرتا ہوں لیکن میری ظرافت بھی مہذب قسم کی ہوگی

نبھاؤں فکر کو اس حسن سے جامۂ ظرافت کا

کشادہ ہر طرف تہذیب کا جس میں کہ دامن ہو

اور واقعہ یہ ہے کہ ساری عمر انھوں نے اس مہذب ظرافت کی روش کو نباہا اسی غزل میں انھوں نے اپنے زمانہ کی مروجہ اردو شاعری اور اسکی فرسودہ روایات کا مضحکہ خوب اڑایا ہے صفیؔ اور ظریفؔ اس زمانے کے ترقی پسند شاعروں میں سمجھے جاتے تھے چند اشعار اس غزل کے ملاحظہ ہوں ۔

گرہ ہوں، گتھیاں ہوں پیچ و خم سے جس کے الجھن ہو

یہی مضمون جو بٹنا ہے تو زلفیں کیوں ہوں بھر رسن ہو

لب شیریں اگر معشوق کا قند مکرّر ہے

جبھی جانیں کہ بیٹھیں مکھیاں اور ماس پہ بھن بھن ہو
جو دیکھیں آگیا بیتال آنکھیں بند ابھی کرلیں
مگر خواہش یہ ہے ہیش نظر وادیٔ ایمن ہو
یہی وحشت اگر دستِ جنوں کی ہے تو اے بھائی
دوپٹہ اوڑھ لو جس میں گریباں ہو نہ دامن ہو
دہن کلھیا سا ہو چہرہ طباق اور پیٹ مٹکی سا
قباحت پھر نہیں کچھ گر صراحی دار گردن ہو
مچائے شور و غل آہِ شرر افشاں کرے ہر دم
یہی اوصاف لازم ہیں تو عاشق کیوں ہو انجن ہو
ہمارا جھوجھ پھلواری میں ہو کوئی نہیں کہتا
یہی کہتے ہیں یارب باغ میں اپنا نشیمن ہو
ظریف انصاف سے کہدو وہ عاشق ہے کہ چوہا ہے
زمین قصر جاناں میں جو یہ چاہے کہ مسکن ہو

ظریف مشاعروں میں غزل خاص انداز سے پڑھنے بیٹھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نہایت باوقار شاعر اپنا بہت سنجیدہ کلام سنانے جارہا ہے ساری محفل ان کے اشعار سن کر ہنستے ہنستے لوٹ جاتی تھی مگر کیا مجال کہ ان کے ہونٹوں پر تبسم کی ذرا سی جھلک بھی آجائے۔

۱۹۰۳ء سے ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا اور مختلف رئیسوں اور نوابوں کی سرکاروں میں کام کرتے رہے اسی ملازمت کے سلسلہ میں انھیں ہندوستان عراق

اور ایران کے مختلف مقامات پر بھی جانے کا اتفاق ہوا اسی ضمن میں انھوں نے ایک طویل نظم "سفرنامہ" کے عنوان سے لکھی تھی جو بہت دلچسپ ہے اس میں بمبئی سے عراق تک سفر کی داستان ہے یہ سفر ۱۹۰۶ء میں کیا گیا تھا اس زمانے میں جہاز پر مسافروں کا جو حال ہوتا تھا یا یوں کہیئے کہ جو درگت منتی تھی اس کی تصویر کشی نہایت خوب کی ہے پوری نظم محاکات کی ایک تصویر ہے یہاں دو چار بند اس مقام کے ملاحظہ ہوں جن میں لکھنؤ کی چند پردہ نشین عورتوں کی پریشانیوں کا وہ منظر دکھایا گیا ہے جب انھیں جہاز پر ایک سیڑھی کے ذریعہ چڑھنا پڑا لکھنؤ کی بیگماتی زبان کا نمونہ بھی خوب پیش کیا ہے سنیئے۔

تھیں جن کے ساتھ عورتیں ان کا نہ پوچھو حال
لیجانا اور لانا تھا اک جان کا وبال

سیڑھی سے انکو لے کے اترنا تھا اک کمال
بے پردگی کا دھیان نہ پردے کا تھا خیال

یہ پردہ داری جان کے اوپر عذاب تھی
ان عورتوں سے مردوں کی مٹی خراب تھی

کہتی تھی کوئی لو مرا برقع اٹک گیا
ہے ہے نیا تھا تین جگہ سے مسک گیا

صاحب سنبھالو سر سے دوپٹہ کھسک گیا
لو پائچہ الجھ گیا مقنع سرک گیا

کیا گت بنی ہے سب کی نگوڑے جہاز پر
بھیلن ہے کس غضب کی نگوڑے جہاز پر

لو بیوی باندان کا ڈھکنا بھی گر گیا
آفت پڑے جہاز پہ کتھا بھی گر گیا

توبہ ہے میرے بچے کا بجوا بھی گر گیا
اے لو نگوڑے طوطے کا پنجرہ بھی گر گیا

کشتی پہ بچی رہ گئی ہے ہے غضب ہوا

بٹیا کی ٹوپی بہہ گئی ہے ہے غضب ہوا

چاندی کی لوسلائی مری کھو گئی موئی　　ہلڑ نگوڑ مارا یہ کاہے کا ہے اوئی
ہے ہے نکالی کس نے تلے دانی سے سوئی　　ناخون کاٹنے کی مری قینچی کیا ہوئی

لڈن کے گھنگرو، بہو کی چھاگل بھی گر گئی
لونیسے سر کے تیل کی بوتل بھی گر گئی

کیا چھوٹی سیڑھیاں ہیں نگوڑی خدا کی مار　　ایسا جہاز نوج ہو در گور دور پار
ہلتی بھی ہیں نگوڑیاں جن کو نہیں قرار　　رسی میں ڈنڈے باندھ دیے ہیں یہ پانچ چار

زینہ نگوڑ ماروں نے کیسا بنایا ہے
یہ تو موؤں نے نٹ کا تماشا بنایا ہے

ننھی سی یہ کوٹکیا اور اتنی بڑی چڑھائی　　پیروں سے نکلی جاتی ہے پھسلن سے زیر پائی
ہے ہے نگوڑی بھیگ گئی سب نئی رضائی　　بیوی وہ بندی ایسی زیارت سے باز آئی

قربان جاؤں اے مرے مولا بچائیے
لونڈی کو اپنی آن کے آقا بچائیے

پہونچوں گی ابکی گرچہ اصل خیر سے میں گھر　　بیوی اُٹیھٹے کان کروں گی نہ پھر سفر
قسمت میں کھانا ٹھوکریں لکھا تھا دربدر　　ہچکولے مجھ کو یاد رہیں گے یہ عمر بھر

وہ کون لوگ ہیں کہ جو آتے ہیں بار بار
سچ ہے بوا کہ گھر ہے غنیمت ہزار بار

لیکن یہ سمجھنا کہ ظریف محض ہنسنے ہنسانے کے لئے شاعری کرتے تھے صحیح نہ ہوگا ان کا دل اپنی قوم، اپنے ملک کے لوگوں کی خامیوں اور بے راہ روی سے اتنا ہی کڑھتا تھا

جیسا کہ کسی شریف اور ہمدرد قوم لیڈر کا دکھ سکتا ہے لیکن وہ ناصح کی طرح سمجھانے کے بجائے اس احساس کو کہیں ظرافت اور کہیں طنز کے چھینٹوں سے اس قدر ادا کر دیتے تھے کہ ہنسی ہنسی میں سمجھنے والوں کے لئے عبرت کا تازیانہ بن جاتا تھا ان کی زیادہ تر غزلیں اور نظمیں اسی اصلاحی جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں یہاں مثال کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے اپنے زمانے کی فیشن پرستی پر کچھ پھبتیاں کسی ہیں ؎

سمجھئے آپ اسے فیشن کا ایک دیوانہ ہو جس کی شکل زنانی لباس مردانہ
خیالِ پیرس و لندن نے کر دیا مدہوش کہ اب نظر میں نہ کعبہ ہے اور نہ بتخانہ
گناہ ہے حج و تیرتھ بحکم دورِ جدید طوافِ شملہ و لندن ہے فرض سالانہ
وہ کلب، سینما، ریس کورس، دورِ شراب مہذبوں کے یہ اقوال ہیں حکیمانہ
زباں سے ہیں ابھی وحدانیت کے کچھ قائل مگر خدا ہے ہر اک شخص کا جداگانہ
ہے اتحاد فقط ایک لفظ بے معنی زمانہ جب کہ ہے روحانیت سے بیگانہ

ظریفؔ ختم کرو داستانِ عہد جدید
سنے گا کون بہت تلخ ہے یہ افسانہ

لیکن غزلوں سے بہتر ان کی وہ نظمیں ہیں جن میں انھوں نے واقعات نگاری کا کمال دکھایا ہے اور اودھ کے دیہاتی لوگوں کی زبان میں کسی واقعے کا نقشہ کھینچا ہے اس سلسلے میں ان کی ایک نظم "شامتِ الکشن" کے عنوان سے ہے ۱۹۳۲ء میں لکھنؤ میونسپل بورڈ کے الکشن کی بڑی دھوم تھی۔ ممبری کے امیدواروں اور ووٹروں کے درمیان جو ماجرے عموماً میونسپلٹی کے الکشن میں ہر جگہ پیش آتے ہیں

ان کا نقشہ اس نظم میں خوب کھینچا گیا ہے یہاں ایک امیدوار کی کوشش پیش کی
جاتی ہے نام سب فرضی ہیں :—

سنئے ایک صاحب کا قصہ جو ہوئی شامت سوار　　یہ ضمانت کر کے داخل بن گئے امیدوار
چھوڑا پیشہ ترک فرمایا جو کچھ تھا کاروبار　　کچھ اثاث البیت بیچا کچھ لیا سودی ادھار
مضطرب رہتے تھے یہ نام آوری کے واسطے
گھر سے نکلے ووٹ لینے ممبری کے واسطے

سب سے پہلے جس ووٹر کے گھر پہونچے ان کا نام شیخ بدھو تھا اور وہ بڑے
انداز سے بیٹھے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے ان کو جس ووٹر کے گھر جانا پڑا　　شیخ بدھو نام تھا اور تھا جولاہا قوم کا
دھوتی باندھے مرزئی پہنے تنا بیٹھا ہوا　　اک سٹرا مٹی کا حقہ پی رہا تھا کج ادا
جاتے ہی تسلیم کی جب اسکو با صد احترام
منہ کو ٹیڑھا کر کے بولا کو ہے! بالیکم سلام

بولے یہ پہلے نہ آیا میں ہوا اتنا قصور　　شیخ بدھو آپ مجھ پر رحم فرمائیں حضور
آپ کو والد کہا کرتے تھے بھائی اب سے دور　　میں بھتیجا آپ کا ہوں ووٹ لینے کا ضرور
بولے بدھو، کا کہیو ہم کہکا کہکا ووٹ دے ای
ووٹ پیسے او، جو ترسے ہم کا دیں کا ووٹ دای

ساس یہ مینا سیٹی ہے نہ جانے کا بلا　　اور تم جو ممبر جو ہوئی جیہو تو ہمرا بھا ئدا
ہم کبھو تم کا نہ دیکھا اور نہ تمرے باپ کا　　اٹے تہی آوت بنا یو ہن نہک ہم کا چچا
ہوئی گوا ہیا ر بڑھوا، تم چلے ہو چوٹ دے

کان پکڑا ہم نہ جائیں اب کبھو کا ووٹ دے

شیخ بدھو کچھ چلی کٹی اس سلسلے میں میونسپلٹی کے متعلق سناتے ہیں آخر کار امیدوار صاحب نے

جب میاں بدھو کے تیور اس قدر دیکھے کڑے ۔۔۔ داہنے بائیں دیکھ جھٹ قدموں پہ اسکے گر پڑے

دل میں پچھتائے کہ آخر کیوں ہوئے تھے ہم کھڑے ۔۔۔ کوئی ایسے جاہلوں سے کیا کوئی کشتی لڑے

آبرو کے ساتھ دے کر پانچ راضی کر لیا

کامیابی پر ہوئے خوش تاؤ مونچھوں پر دیا

یہ پوری نظم اسی طرح کے دلچسپ واقعات سے پر ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ جس طبقے یا پیشے کا ہے زبان اسی کی استعمال کی ہے اس سے نظم کی واقعیت میں چار چاند لگ گئے ہیں ۔

اسی انداز کی ان کی ایک اور نظم شہر آشوب کے نام سے بہت مشہور ہے اس میں شاعروں اور شعرائے کرام اور اہل ذوق کی زندگی کا بہت عمدہ خاکہ پیش کیا گیا ہے اس نظم میں دراصل ظریف اپنے کمال پر نظر آتے ہیں نظم کی ابتدا میں تو شعر و شاعری کی حد سے زیادہ کثرت پر اظہار افسوس کیا ہے اور کہا ہے کہ ہندوستان میں شاعری اور تعلیم کا تناسب یوں ہے کہ ع

شاعر اسی فیصدی، تعلیم نوّیں سات کی

پھر شاعر کی نفسیات کا نقشہ یوں کھینچا ہے ے

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنس عجیب ۔۔۔ جو سنانے کے لئے بے چین رہتا ہو غریب

اسکو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب ۔۔۔ شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضہ کے قریب

چاہتا ہے سب سنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

پھر اس کے بعد اسی نظم میں کسی دیہات کی ایک بزم مشاعرہ کا حال تفصیل سے اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے تو شعرائے کرام کی آمد ان کے استقبال اور ان کے جلوس کی شان دکھائی جاتی ہے دیہات کے لوگ اس جلوس کو دیکھ کر چہ میگوئیاں کرتے ہیں بعض ان لوگوں کو گویّے سمجھتے ہیں مگر تعجب کرتے ہیں کہ سارنگی طبلے کے بغیر یہ لوگ کیونکر اپنی اپنی غزلیں گائیں گے بعض کہتے ہیں جب تک اس برات میں طوائف کا ناچ نہ ہو کیا لطف آئے گا غرضکہ آخر کار مشاعرہ شروع ہوتا ہے اب جو دیہاتی لوگ ان شاعروں کے متعلق اپنی اپنی رائے دیتے ہیں اس مقام کے دو ایک بند ملاحظہ ہوں ظریف شاعر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؂

اس طرح تعریف کرتے ہیں تری اکثر گنوار — کا ہے رگھو نندن کبھو دیکھے رہیو ایسی بہار
یو بڑا شاعر بڑے آوا ہے کونو بوردار — اس پڑھے مال لام باندھس مجگئی کوا گھار

جون بریا پڑو ہس بانکی گجل جھلائے کے
کو دیکھو سے لاگ کو ورہ گوا منھ بائے کے

یاک بریا اور ہم دیکھا رہے کریا ندھان — جب گئیں کمپو ماں جیسن ہوئی پکا گنگا نہان
کانگریس کا ایک یلم ٹیریہ کینس بکھان — آل انڈیا سبھا ہوئے جلیس دیا کھے کسان

اس سمان دیکھا کبھی، کا تم سے ہم بھیا کدار
یاک بولا سب منین چھپان جس بولیں سیار

اس کے بعد ایک کبڑیا اپنی رائے یوں دیتا ہے ؂

اک کبڑیا سن کے یوں کرنے لگا اظہارِ رائے — یہ تو ساعر تھا پھسڈی اور بڑھیا کو ڈرائے

جو گجل ماں جلف کی ماسوک کا نکتا دکھائے — ہم سے سو کھینوں کے دل پر چھپ رعاب اپنا جمائے

ڈانٹ کے للکار کے ہر ایک بے پھل میں پڑھے

جو گجل مُوڑ کے پہ کہہ ڈالے مکابل میں پڑھے

بھائی مولاگنج جس بستی میں ہم آباد ہیں — اس جگہ ساعر بڑے بڑے بڑھیا ہیں اور جاد ہیں

ان سبھوں میں ایک بدلواک جگت استاد ہیں — ان کو ہر موکے کی گجلیں منہ جبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں!

ساعروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

نام تو ہے ایک بدلو اور تکھلس ہے بدل — کا کہیں اللہ کا ہے ان کے اوپر کا پھجل

کا پھٹے ایسے ملاتے ہیں وہ بڑھیا اور ڈبل — ایک گھنٹے میں کہو سو سعر کی کہہ دیں گجل

جور کر دیں وہ کہیں پڑھنے جو بیٹھیں سام سے

کانپتے ہیں اور ساعر لوگ ان کے نام سے

یہ نمائش میں ابھی دیوٹے گئے تھے پارسال — ایک حکائی گجل ایسی سنائن بے مثال

حاکم اور تیسیل دار ایسے ہوئے سن کے نہال — دیدیا تمغا انھیں سونے کا تعجب بے کیل و کال

اور جو ساعر نمائش میں گئے رہیں ہو گئے

بس جگت استاد بدلو گول ڈس ہو گئے

۱؎ ضلع بارہ بنکی کا مشہور قصبہ جہاں ہر سال شروع جاڑے میں ایک میلہ لگتا ہے مختلف چیزوں کی سرکاری نمائش بھی ہوتی ہے اور اسی سلسلے میں ایک بزم مشاعرہ ترتیب دی جاتی ہے ۱۲

پوری نظم میں اسی طرح کے دلچسپ بند ہیں ان کے دیوان میں جس کا نام دیوانجی ہے اسے پورا پڑھ کر لطف اٹھایا جا سکتا ہے یہ تھے ظریف لکھنوی اور ان کی مزاح نگاری! یہ صحیح ہے کہ اکبر الہ آبادی جیسی نظر اور آمد ان کے کلام میں نظر نہ آئے گی لیکن ان کی زندہ دلی سے کون انکار کر سکتا ہے؟

اصغر گونڈوی

؎ اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا۔

نہیں معلوم آپ اصغر صاحب سے ملے ہیں یا نہیں، نہیں ملے ہیں تو آپ سے تعارفاً عرض کردوں کہ اگر کسی شخص کی پوری سیرت اور شخصیت کو صرف ایک لفظ سے ظاہر کیا جا سکتا ہے تو اصغر گونڈوی مرحوم کی رفتار و گفتار، عادات و اطوار رہن سہن لباس پوشاک خیالات و تصورات ہر چیز کو صرف ایک لفظ سے ظاہر کر سکتے ہیں اور وہ لفظ ہے نفاست یا پاکیزگی بلند بالا قد، خوش وضع خوش پوشاک، سر پر پٹے، ابھری ہوئی فرانسیسی قطع کی داڑھی، سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی، چست پاجامہ، چہرہ پر جھوما شگفتگی، اگر آپ ان سے باتیں کرتے تو محسوس ہوتا کہ یہ شخص ایک خاص چیز عطا کرتا ہے اور وہ چیز ہے طمانیت قلب ہر ذہین آدمی کو سکون قلب مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے کیونکہ طرح طرح کی الجھنیں اسے بے قرار کرتی رہتی ہیں لیکن جو ذہین آدمی ان تمام بے قراریوں

کو ہضم کر کے سکونِ قلب یا نفسِ مطمئنہ حاصل کر لے اسی کو صحیح انسان کہا جاتا ہے اور
یہ سکون قلب بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے ویسے تو سب ہی جانتے ہیں کہ
اصغرؔ صاحب کی تعلیم و تربیت کوئی خاص یا غیر معمولی قسم کی نہ تھی عربی فارسی اور
انگریزی یہ سب واجبی ہی واجبی جانتے تھے باپ قانون گو تھے ان کے پاس
اتنے پیسے کہاں، نہ اتنی فرصت کہ اصغرؔ مرحوم کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکتے یا ان کی تربیت
و تعلیم پر غیر معمولی توجہ کر سکتے اور پھر وہ زمانہ بھی قدامت پرستی کا تھا اصغرؔ صاحب
۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے گھر کی پریشانیاں الگ، گورکھپور میں پرانی وضع کے مسلمانوں
کا طبقہ انگریزی تعلیم کو اچھی نظروں ہی سے کب دیکھتا تھا بہرحال انگریزی اسکول
میں نام لکھایا گیا لیکن انٹرنس بھی پاس نہ کرنے پائے تھے کہ یہ سلسلہ منقطع کر دینا پڑا
پھر ان کے والد اپنی ملازمت کے سلسلے میں مستقل طور سے گونڈہ میں مقیم ہو گئے یہاں
بھی کوئی خاص توجہ ان کی تعلیم کی طرف نہ دی جا سکی خود اپنے شوق سے جو کچھ اور
جتنا کچھ پڑھ لیا وہ پڑھ لیا آپ پوچھیں گے پھر اصغرؔ مرحوم میں یہ شرافت یہ انسانیت
یہ پاکیزگی اور نفاست یہ رکھ رکھاؤ اور سلیقہ کہاں سے آ گیا کچھ صلاحیتیں فطری
ضرور ہوتی ہیں لیکن ان پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہوا کرتی ہے آج کل جیسی
کتابی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں ملتی ہے اس سے ہم آپ سب خوب واقف ہیں
کہ واقفیت چاہے جتنی بڑھ جائے سلیقہ نہیں آتا خبر مل جاتی ہے نظر بھٹکتی رہتی
ہے تو پھر اصغرؔ مرحوم کی نظر میں وسعت اور لطافت کہاں سے آ گئی؟ آپ جانتے ہوں
گے کہ اصغرؔ مرحوم منگلور ضلع سہارنپور کے ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالغنی صاحب کے
مرید تھے یہ پیری مریدی اکثر تو رسمی ہوا کرتی ہے لیکن جب کسی دل والے کو صاحبِ

نظر مل جاتا ہے تو اکثر ایک ہی نگاہ میں دل و دماغ کی وہ اصلاح ہو جاتی ہے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں جمال دوست قلب و نظر میں سرایت کر جاتا ہے اور پھر اسی حسن و جمال کی کرنیں طالب کے شعور و ادراک کو منور کر دیتی ہیں ظاہر و باطن ذکر و فکر اخلاق و معاشرت سب میں ایک حسن و پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے تصوف کے نظریات کو بعض نااہل لوگوں نے ضرور بدنام کیا لیکن جو اس کے اصولوں پر خلوص طلب کے ساتھ عمل پیرا ہوئے وہ کندن ضرور بن گئے اصغر مرحوم کے کلام میں جو سوز و گداز جو حسن آفرینی جو رنگینی اور روشنی نظر آتی ہے وہ اسی نظریے کی مرہون منت ہے جو حسن کو مطلق مان کر اور اس پر بیتابانہ توجہ دینے سے حاصل ہو سکتی ہے یہ حسن و جمال ایک طرف تو خیال اور ادراک کو کاوش حسن آفرینی میں مبتلا کر دیتا ہے دوسری طرف اخلاق اور معیشت میں اس حسن کو پیدا کر دیتا ہے جسے حسن اخلاق، رکھ رکھاؤ سلیقہ محبت اور شرافت وغیرہ کہا جاتا ہے یا جسے مختصراً انسانیت کہہ لیجئے۔

فرض کیجئے مرحوم کی زندگی میں آپ کو الہ آباد جانے کا اتفاق ہوتا جہاں اصغر صاحب ہندوستانی اکیڈیمی کی ملازمت کے سلسلے میں مقیم ہو گئے تھے کٹرہ میں لب سڑک دوکانوں کے اشتہارات دیکھتے دیکھتے آپ ان کے مکان پر پہونچ جاتے اطلاع ہوتی آپ انکے ڈرائنگ روم میں بلکہ جسے عرف عام میں بیٹھک کہہ سکتے ہیں بٹھا دیے جاتے آپ دیکھتے کہ نہایت صاف شفاف چاندنی کا فرش بچھا ہے گاؤ تکیے لگے ہیں دیواروں پر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی قلعی کی گئی ہے الماریاں وارنش سے چمک رہی ہیں ایک کونے میں اگالدان رکھا ہوا ہے دوسری طرف سگرٹوں کا خاکدان، کثیف دکانوں اور کثیف لوگوں کے درمیان اصغر صاحب اور ان کا مکان عجب انمل بے جوڑ

قسم کی چیز معلوم دیتا تھا مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اصغر صاحب اپنی سرشت سے مجبور تھے اور ان کے ہمسائے اپنی عادت سے لاچار، اصغر صاحب کی آمدنی کبھی زیادہ نہیں رہی لیکن اپنی قلیل آمدنی میں بھی وہ اس فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی مہمان کسی قسم کا آجائے اس کی قدر و منزلت اس کی حیثیت کے مطابق کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی دل دہی اور دلداری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر اسے ان کی کوئی چیز پسند آجاتی تو جب تک اس کے سر نہ منڈھ دیتے چین نہ آتا تھا اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ ایسا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے رئیس ہیں یہی رکھ رکھاؤ اور سلیقہ ان کی گفتگو اور لہجہ میں تھا ہر شخص کے مرتبہ اور درجہ مذاق اور پسند کا خیال رکھتے تھے اور اس کی مناسبت سے اس سے گفتگو کرتے تھے بات کرتے وقت ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر ہمیشہ کھیلتی پائی گئی نرم لہجہ شیریں انداز تکلم، خوش کن جملے، دلآویز فقرے، شگفتگی اس پر مستزاد، سننے والا ان کے پاس جب تک بیٹھتا یہی چاہتا کہ وہی گفتگو کئے جائیں اور جب اٹھتا تو اس احساس کے ساتھ کہ آج واقعی ایک انسان نظر آیا۔

حسن اخلاق کا یہی پرتو آپ کو اصغر کی شاعری میں جلوہ نما نظر آئے گا یعنی اگر آپ واقعی اصغر صاحب سے نہیں مل سکے ہیں تو ان کے اشعار میں اصغر صاحب کی کچھ نہیں پوری شخصیت جھلکتی نظر آئے گی آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض حسین چہروں میں ایسی معصومیت اور ساتھ ہی ایسی دلکشی ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ بس انھیں دیکھا ہی کرے، روح میں ہوس کا کہیں شائبہ تک بیدار نہیں ہوتا یہی کیفیت اصغر کی شاعری کی ہے یہاں عام شعرائے اردو کے برخلاف ایک عالم ہی نیا

نظر آتا ہے جیسے ہم فردوس نظر یا جمالستان ہی کہہ سکتے ہیں سارے کلام میں حسن تخیل حسن نظر اور حسن ادا ہی کے کرشمے ہیں وہ بھی ایک ندرت، ایک تازگی اور شگفتگی کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھ کر ہمیں حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ حیرت یہ دیکھ کر کہ ہمارے باغ ادب میں ایک ایسا تر و تازہ شگفتہ و شستہ چمن بھی ہے اور خوشی یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ شاعری جیسا فنِ لطیف واقعی اس قدر لطافت رکھے تب ہی وہ فنِ لطیف بجا طور پر کہا جا سکتا ہے دو چار مثالیں آپ ملاحظہ کریں آپ خود محسوس کریں گے کہ تشبیہہ و استعارہ کے مفہوم میں جان پڑ گئی ہے یا نہیں؟

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رونقِ نکھر آئی گلستاں کی

عارض رنگیں پہ ان کے رنگ سا کچھ آ گیا
ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسم کو
کہ بحرِ حسن کی اک موجِ بے قرار نہ ہو

یہ حسن کی موجیں ہیں یا جوشِ تبسم ہے
اس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

اس عارضِ رنگیں پہ یہ عالم وہ نگاہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھتے

تم دید کو کہتے ہو آئینہ ذرا دیکھو
خود حسن نکھر آیا اس کیفِ تماشا سے

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

لالہ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار
رخِ رنگیں پہ جو آ جائے حیا ہو جائے

آپ نے یہ حسن کاری دیکھی آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ نظر میں حسن نہ ہو تو دنیا کی کوئی شے حسین نظر نہیں آتی لیکن حسن نظر پروردۂ محبت ہے اس لئے غزل میں ہے

حدیثِ سوزِ محبت نہ ہو تو کیونکر ہو

اس حدیث سوز و درد محبت کی چاشنی کا بھی اندازہ کرتے چلئے۔

ادائیں چھپ نہیں سکتیں نواز شہائے پنہاں کی
مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب ان کا

ہائے وہ اتصالِ ناز و نیاز
لذتِ سجدہ ہائے شوق نہ پوچھ

وہ ربط خاص، رنجش بیجا کہیں جسے
شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے

جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے
سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا

رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے خنجر لئے ہوئے
میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں

شاداب ہوگیا چمنستانِ آرزو
کوثر کی موج تھی تری ہر جنبشِ خرام

حیراں ہوں دیکھ دیکھ کے اپنی نظر کو میں
نیرنگئ جمال کے قربان جائیے

جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا
مری نگاہوں نے جھک جھک کے کردیئے سجدے

اگر آپ کو غزل میں اسرار و معارف اور فلسفہ و حکمت کی غمازیاں پسند ہیں تو اصغر صاحب کے یہاں اس قسم کی دعوتِ فکر و نظر کا سامان بھی موجود ہے اور کثرت سے موجود ہے۔ بادہ و ساغر کے رنگ میں بھی اور لباس بے رنگی میں بھی ملاحظہ فرمائیے۔

جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا
پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا

مجھ کو خبر رہی نہ رخِ بے نقاب کی
تھیں خود نمودِ حسن میں شانیں حجاب کی

اب کون کہے اس کو جلوہ نظر آتا ہے
نظارہ بھی اب گم ہے بے خود ہے تماشائی

شکلِ صفات معنیِ اشیاء کہیں جسے
اب تک تمام فکر و نظر پر محیط ہے

پردہ پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے

فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے

ایک اور قدم بڑھ کر اے ہمت مردانہ
یہ دین وہ دینا ہے یہ کعبہ وہ بتخانہ

کتنے لطیف اشارے تھے چشم ساقی کے
نہیں ہوا کبھی بے خود نہ ہوشیار ہوا

کیا فیض بخشیاں ہیں رخ بے نقاب کی
ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

آپ نے دیکھا کہ کیا غوامض اور نکتے کس کس طرح پانی کر دیئے گئے ہیں اور پھر ہر جگہ ایک جوش و سرمستی کا عالم ہے حقیقت یہ ہے کہ جوش و سرمستی ہی اصغرؔ کے تغزل کی شان ہے نشاط روح یا سرود زندگی ان کا کوئی مجموعۂ کلام اٹھا لیجئے ہر شعر میں ایک نشہ ایک کیف سا نظر آئے گا ایسا سرور جو کسی بادۂ مستعار کا رہین منت نہیں اس بادۂ خوشگوار کے چند جرعے اور سہی۔

کیا کہیے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجوم شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

رند جو ظرف اٹھالیں وہی ساغر بنجائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشم تحیر کو ہے سکوت
اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائگاں ہے وہی رائگاں نہیں

فطرت جارہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اصغرؔ کے کلام میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے جسے فروتر یا دوسرے درجہ کا کہا جا سکے جو چیز ہے وہ خاصے کی چیز ہے معیار کی یہی بلندی ان کی سیرت میں بھی کارفرما تھی کبھی فروتر یا دوسرے درجے کی بات نہ کہتے نہ کرتے سنتے اور سہتے ہر طرح کی تھے ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدوں نے ان کے کلام پر بڑی کڑی نظر ڈالی سخت سخت نکتہ چینیاں کیں لیکن انھوں نے اپنی زبان سے

ان کے حق میں کوئی ناشائستہ بات کبھی نہیں کہی رشید صدیقی صاحب راوی ہیں
کہ مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار
ہوں حسن کا عنصر شاعر ہے اور شاعر کا عنصر نقاد ہوتا ہے یہ کڑیاں اٹھ جائیں تو دنیا
اختلال محض ہو کر رہ جائے۔

آخر میں جب ان پر فالج کا حملہ ہوا تو غالباً ڈاکٹروں کی صلاح سے الہ آباد
کے سینٹ ہال کے سامنے بلو ڈیر کے کھلے اور پر فضا احاطے میں ایک مکان کرایہ پر
لے لیا تھا۔ الہ آباد کے اکثر لوگوں کو اب تک ان کی وہ چہل قدمی یاد ہے جو وہ
اپنے اس مکان سے احاطے کے پھاٹک تک کے طویل راستے پر کرتے نظر آتے تھے
ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیا ہوتی دوسرے میں نفیس سگریٹ یا سگار کے ڈبے
افسوس کہ یہ شریف انسان اور شریف نظر شاعر ۱۹۳۶ء میں فالج کے ایک شدید
حملے سے جانبر نہ ہو سکا اور یہیں الہ آباد کی سرزمین میں ابدی نیند سو گیا۔ کسی عزیز
یا کسی دوست کی موت ہو ہم سب افسوس کرتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اصغر
صاحب کا نظریہ اس معاملہ میں بھی کچھ دوسرا ہی تھا وہ بہت عرصہ پہلے کہہ چکے
تھے۔

معاملہ نگہِ ناز سے ہے اے اصغر
بہانۂ الم و حیلۂ قضا معلوم!

فنِ افسانہ نویسی

قصہ ہو یا کہانی، حکایتیں ہوں یا داستانیں، افسانے ہوں یا ناول، ان سب کے لکھنے یا کہنے کے کچھ خاص گر ہوا کرتے ہیں بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہانی یا قصہ کہنے میں کیا دھرا ہے بس کہنا شروع کیا اور قصہ ختم ہو گیا لیکن ایسا نہیں ہے قصہ اور کہانی تو جگ بیتی ہوتی ہے، اگر آپ بیتی بھی آدمی کہتا ہے تو اس میں بھی ایک سلیقہ، ایک ڈھنگ ہونا چاہیئے ورنہ اس میں نہ کچھ لطف آئے گا نہ اس کا کچھ اثر ہوگا سب سے پہلی ضرورت تو یہی ہے کہ قصہ یا افسانہ اس طرح کہا جائے کہ سننے یا پڑھنے والے کا دھیان اسی طرف شوق کے ساتھ لگا رہے اگر قصہ یا کہانی پر سامعین یا ناظرین کا دھیان نہ جما، توجہ اور دلچسپی برقرار نہ رہی تو سمجھئے کہ قصہ یا افسانہ بالکل ناکام رہا۔

سب سے پہلا گر تو یہی ہے کہ اس میں کچھ جدت ہو کچھ نیاپن ہو، یہ نیاپن

خواہ پلاٹ کا ہو، خواہ کردار کا خواہ مکالمے یا انداز بیان کا، جدت کا ہونا بہر حال ضروری ہے کیونکہ اگر کسی قسم کی تازگی، ندرت یا انوکھا پن نہ ہو تو سننے والا گھبرا جائے گا اور اس کی دلچسپی یہ سمجھ کر فوراً کم یا ختم ہو جائے گی کہ یہ تو بہت معمولی قصہ ہے اگر آپ کو کوئی بالکل نیا پلاٹ یا کردار نہ سوجھے (کیونکہ بالکل نئی باتیں اور واقعات تو اب دنیا میں شاذ ہی رہ گئے ہوں گے) تو یہ کیجئے کہ ادھر اُدھر سے نئے یا پرانے واقعات کے ٹکڑے اس طرح ملائیے کہ وہ مرکب بظاہر نیا معلوم ہو، یعنی کم از کم پڑھنے یا سننے والے کو احساس ہو کہ یہ نیا ہے اس نئے پن کے احساس کا افسانے کے خاتمے پر ہونا خاصکر بہت ضروری ہوتا ہے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہر افسانہ کا خاتمہ ہی دراصل توڑ کا مقام ہوتا ہے۔

آپ آجکل کے افسانے پڑھئے تو ان میں ایک دوسری چیز اور نظر آئے گی وہ یہ کہ ندرت ہی ضروری چیز نہیں ہے بلکہ اس میں کسی خیال، کسی فکر یا مقصد کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے بلکہ اکثر تو یہ خیال یا نصیحت یا فصیحت تمام افسانے پر چھائی ہوئی ہوتی ہے بات یہ ہے کہ دراصل ایک اچھے افسانے میں کسی نہ کسی مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے یعنی افسانے کا مقصد محض دلچسپی نہ ہو بلکہ اس میں کوئی کام کی بات بھی نکل سکے تو بڑا اچھا ہے بالفاظ دیگر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کو کچھ سوچنے اور فکر کرنے پر بھی مجبور کرے مگر ہاں یہ خیال ضرور رکھئے کہ کہیں آپ کا افسانہ وعظ و نصیحت کا ایک لیکچر بن کر نہ رہ جائے (جیسا کہ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں عموماً کیا ہے) یا کسی مقصد کا کھلا پروپگنڈہ ہو کر نہ رہ جائے (جیسا کہ آج کل بعض ترقی پسند افسانہ نویسوں کا معمول ہے) بلکہ اصل بات تو دلچسپی کی ہے دلچسپیوں

ہی کی شکر میں ملا کر کوئی دوا اگر آپ کھلا سکیں، چاہے وہ کونین جیسی کڑوی کیوں نہ ہو تب تو آپ کی استادی مسلم ہو سکتی ہے (پریم چند کی مثال سامنے ہے) اگر کوئی مرکزی خیال آپ کے ذہن میں موجود نہ ہو تو انتظار کرتے رہئے، کسی نہ کسی وقت وہ آئے گا ضرور، اس وقت آپ نے اپنا پلاٹ زیب قرطاس نہ کر لیا یا افسانہ نہ لکھ ڈالا تو بس سمجھئے کہ ہاتھ سے گیا پنسل اور کاغذ تو آپ کی جیب میں ہر وقت رہنا چاہئے اگر واقعی آپ کو اچھا افسانہ نویس بننے کا شوق ہے۔

سب سے اعلیٰ قسم کی ندرت یا نیا پن تو وہی ہے جو اس بات کا احساس دلائے کہ جو کچھ افسانہ نویس کہہ رہا ہے وہ واقعہ ہماری سچ مچ کی زندگی سے لیا گیا ہے (جیسا کہ پریم چند کے افسانے کرتے ہیں) یہ سچ یا صداقت کا احساس افسانے کی جان ہے، بغیر اس کے افسانے میں دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی اگر کوئی افسانہ نویس ہماری عام معمولی زندگی کو اسی عام معمولی انداز میں پیش کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ وہ گڑھ جیت گیا۔ ایسے افسانہ نویس کو استادِ کامل کہا جا سکتا ہے لیکن یہ طریقہ ہے بہت مشکل، بالکل سہل ممتنع والا معاملہ ہے جو دیکھنے میں آسان معلوم ہو اور برتنے میں لوہے تک چبائیں۔

ہمارے بہت سے نئے اور نوجوان افسانہ نویس نقل پر گزران کرنا چاہتے ہیں کسی بڑے افسانہ نویس کی ریس کی کوشش بری چیز نہیں ہے لیکن بہت اچھی بھی نہیں کیونکہ اس طرح وہ اپنی نظر پیش نہیں کر پاتے اور آپ یقین مانئے کہ اپنی نظر ہی میں سب سے زیادہ جدت ہوتی ہے ہر آدمی اپنی نظر ہی سب سے زیادہ بھرپور طریقے پر، واضح اور صاف صاف پیش کر سکتا ہے نقل میں یہ بات کہاں ممکن ہے!

یہاں اپنی نظر سے مراد انانیت نہیں بلکہ انداز بیان ہے جس میں اپنی شخصیت، اپنا مزاج اور طریق فکر بغیر کسی آورد کے در آتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیشہ آپ کے افسانوں کو دلچسپی سے پڑھیں تو ان میں خلوص اور صداقت کا مظاہرہ ضرور کیجئے۔ ورنہ آپ محض واقعات کے الٹ پھیر کرداروں کی قلابازیوں مکالمے کی الٹوانسیوں یا مناظر کے تنوع کے اہتمام میں رہے تو آپ کو کامیابی تو ضرور ہو جائے گی لیکن عارضی اور وقتی یہ افسانے اچھے ضرور ہوں گے لیکن ان میں ابدی کشش نہ ہوگی ازل اور ابد کا رشتہ تو صرف خلوص اور سچائی سے قائم ہو سکتا ہے ایک دفعہ فرانس کے مشہور ناول نویس فلابیر نے نوجوان افسانہ نگار موپساں (جو بعد میں خود بھی بہت بڑا افسانہ نویس بن گیا) کو یہ نصیحت کی تھی کہ:-

"دیکھو، دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اپنے اندر ایک راز سربستہ رکھتی ہے اس نامعلوم سربستہ راز کو معلوم کرو مثال کے طور پر کسی معمولی درخت کا ذکر کرنا ہے یا کسی معمولی آتشزدگی کا حال بیان کرنا ہے تو اس درخت یا اس آگ کا حال اس طرح لکھو جیسے تم نے اس سے پیشتر کسی درخت یا کبھی قسم کی آگ کو دیکھا ہی نہیں ہے اگر اس طرح لکھو گے تو تمہارے بیان میں جدت پیدا ہو جائے گی"

افسانہ نگار حضرات عموماً کس قسم کی غلطیاں کر جاتے ہیں؟ افسانوں میں خلوص اور صداقت کی پرکھ کیسے کی جاتی ہے؟ اس کے متعلق بھی دو چار باتیں سن لیجئے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے افسانے اپنے کلی یا جزوی تاثر میں نامعقول یا غیر معقول نہ معلوم ہوں یعنی اسے ہم پڑھ کر یا اس کے کسی حصے یا حصوں کو سن کر یہ نہ کہہ سکیں کہ

بھی یہ بات تو خلافِ عقل ہے یا دنیا میں ایسا کہاں ہوتا ہے یا زندگی میں یہ کیونکر ممکن ہے؟ دوسرے الفاظ میں افسانہ ایسا ہونا چاہیئے کہ واقعی سچا معلوم ہو ویسے افسانہ تو افسانہ ہوتا ہے لیکن قاری کو محسوس ہو کہ یہ واقعہ ہے حالانکہ ایک اچھی اور متاثر کرنے والی کہانی میں تو سچ سے تجاوز کرنا بہتر ہی ہوتا ہے لیکن نامعقول بنیادوں پر نہیں، معقول طریقوں سے، یعنی اچھے افسانوں کے کردار غالباً معمولی سے زیادہ مہربان، زیادہ نیک یا اپنے ماحول سے زیادہ الگ تھلگ نظر آسکتے ہیں لیکن اگر آپ ایسے کردار پیش کریں گے جو انسانی فطرت کے خلاف عمل پیرا ہیں یا پلاٹ کے منت بدلتے واقعات کا شکار ہوتے رہتے ہیں، خود اپنے اندر کوئی جان یا سکت نہیں رکھتے تو ایسے کردار سچے نہ معلوم ہوں گے۔

ہمارے نوجوان افسانہ نگار دوسری غلطی عام طور پر یہ کر جاتے ہیں کہ اپنا پلاٹ یا افسانہ کا ماحول بہت سپاٹ قسم کا قائم کرتے ہیں یعنی ایسا جس میں کوئی ندرت نہیں ہوتی اور آپ جانیئے کہ جس شخص میں ندرت نہ ہو وہ افسانہ نگاری میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

لیکن افسانے کی سب سے بڑی خامی اس وقت رونما ہوتی ہے جب اس میں سستی پیدا ہو جائے یعنی قصہ آگے بڑھتا ہی نہ معلوم ہو معلوم ہو کہ بس ایک جگہ گتھل ہو کر یا قائم ہو کر رہ گیا ہے سننے یا پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جائے اب اگر آپ پوچھیں کہ اس خامی کا علاج کیا ہے تو یہ بتانا ضرور مشکل ہے، کیونکہ اول تو ناظرین کے مذاق میں خود بھی اختلاف ہو سکتا ہے اور یہ مذاق عہد بعہد بدلتا بھی تو رہتا ہے ممکن ہے کہ جو افسانہ آپ کو بارِ خاطر معلوم ہو رہا ہو وہ مجھے بارِ خاطر نہ معلوم ہو یا ممکن ہے کہ جو افسانہ آج سست، سپاٹ، یا گتھل معلوم ہو رہا ہے ایک پشت کے بعد سراہا

جانے لگے۔ غالبؔ اور نظیرؔ اکبر آبادی کے کلام کا حال آپ کے سامنے ہے غالبؔ اور نظیرؔ کی قدر اپنے زمانے میں اتنی نہ ہو سکی جتنی کہ ذوقؔ اور ناسخؔ کی ہوئی تھی لیکن آج ہم غالبؔ اور نظیرؔ کے سامنے ذوقؔ اور ناسخؔ کو بھلا دینے کو تیار ہیں شروع بیسویں صدی میں رنگین اور تخیلی قسم کے افسانوں کا رواج تھا پریم چند کے افسانوں کی وقعت معمولی، سپاٹ اور سیدھے سادے قصّے کہانیوں سے زیادہ نہ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج ـــــ ؟ باایں ہمہ افسانوں میں اس سستی اور جمود کا کوئی علاج اگر تجویز کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ ان میں عمل اور رفتار پیدا کی جائے عمل اور رفتار کی تجویز کو غلط نہ سمجھ لیجئے گا۔ یعنی اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر وہ کہانی جس میں متواتر نئے نئے مواقع اور عمل دکھائے جائیں، وہی افسانہ افسانہ بن سکتا ہے یا صرف وہی کہانی ناظرین کے دل و دماغ پر چھا کر رہ جائے گی۔ عمل اور رفتار سے مراد صرف یہ ہے کہ کہانی میں کہانی کی دلچسپی ضرور باقی رہے یعنی یہ اشتیاق ضرور باقی رکھا جائے کہ آگے کیا ہوگا کوئی نہ کوئی دلچسپ بات پیدا ہو کر قصے کو آگے ضرور بڑھاتی رہے۔

چوتھی غلطی جو عام طور پر افسانوں میں نظر آتی ہے، وہ یہ کہ افسانہ نگار بعض اوقات جن چیزوں کو پیش کرتا ہے خود بھی ان سے واقف نہیں ہوتا مثلاً جس مقام یا ماحول کو آپ افسانے میں دکھا رہے ہیں اس سے بالکل یا بہت کم واقف ہوں یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا غالباً ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں ایک صاحب اپنا ایک افسانہ میرے پاس لائے تاکہ میں اسے اپنے رسالے میں شائع کر دوں (اس زمانے میں میں رسالہ جامعہ کا ایڈیٹر تھا) انھیں اپنی افسانہ نگاری پر کچھ ناز بھی تھا۔ اور ان کے اکثر

فسانے دیگر رسالوں میں شائع بھی ہو چکے تھے لیکن جو افسانہ وہ میرے پاس لائے
تھے اس میں لکھنؤ کے مشہور محلہ امین آباد کا ماحول پیش کیا تھا ستم ظریفی یہ کی تھی کہ
امین آباد کے چوراہے سے کچھ ایسی سڑکیں انھوں نے نکال دی تھیں اور ان کی کچھ
ایسی سمتیں مقرر کی تھیں جو محض فرضی اور خیالی تھیں ان کی اس واقعاتی غلطی پر جب
نگاہ کیا گیا فرمانے لگے کہ افسانہ تو افسانہ ہی ہوتا ہے۔ اس میں یہ سب جائز ہے
اتفاق سے وہیں دفتر میں ایک اور رسالہ رکھا ہوا تھا جس میں ایک خاتون
کا بہت اچھا افسانہ ان دنوں شائع ہوا تھا مزید یہ خاتون اسی یونیورسٹی
میں زیر تعلیم تھیں جہاں موصوف پڑھ رہے تھے بتایا گیا کہ دیکھئے افسانہ یوں لکھا
کیجئے جیسے یہ خاتون لکھتی ہیں چڑ گئے اور اس افسانہ نگار خاتون کی افسانوی خامیاں
بیان کرنے لگے ـــــ دو تین سال بعد معلوم ہوا کہ صاحب موصوف نے اسی خاتون
سے عقد کر لیا یہاں یہ ضمنی واقعہ ذرا طویل ہو گیا کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ
آپ اپنے افسانوں میں واقعاتی غلطی نہ کریں ورنہ ایسے افسانے مضحک ہو کر
رہ جائیں گے اور ناواقف یا کم واقفیت سے آپ کی حقیقت پسندی کا بھانڈا
پھوٹ کر رہ جائے گا۔

نئے افسانہ نگاروں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض باتیں بذاتِ خود مقبول
نہیں ہوتیں افسانہ چاہے جتنا اعلیٰ پیمانے کا اور اعلیٰ تکنیک کا کیوں نہ ہو مثلاً بہت کم
رسالے ایسے ہوں گے جو پریشان کن یا گھناؤنے قسم کے افسانے شائع کرنے کو تیار
ہو جائیں گے فرض کیجئے جنون کا موضوع ہے اگر یہ افسانے میں لایا جائے تو شاید
ہی مقبول ہو سکے لکھنے والا چاہے جتنا بڑا استاد ہی کیوں نہ ہو خشک یا مایوس کن

نقطہ نظر پسند بھی نہیں کیا جاتا یا ایسی ٹریجڈی جس میں انتشار کے بعد سکون نہ پیدا کیا
گیا ہو، کسی اچھے رسالے میں جگہ نہ پا سکے گی مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانہ
میں میں نے ایسا ہی ایک حزنیہ افسانہ لکھا تھا جس میں ایک دیہاتی عورت کو
اس طرح دکھایا گیا تھا کہ وہ گرمی اور لو اور پیاس کی شدت کی وجہ سے تڑپ رہی
تھی گھسٹتے گھسٹتے کسی کنوئیں پر پہنچ گئی تھی لیکن پھر بھی پانی نہ پی سکی اور
جاں بحق تسلیم ہو گئی، شائع ہو جانے پر جب اس افسانے کو میں نے پڑھا تو یہی
جی چاہتا تھا کہ یہ تکلیف دہ افسانہ یا تو میں نہ لکھتا یا شائع نہ ہو سکتا ناظرین عموماً
تسکین دہ، پر امید اور خوش کن افسانے پسند کرتے ہیں اسی لئے اچھے رسالوں کے
اڈیٹر کبھی اپنے ناظرین کو کرب و تکلیف دینا نہ چاہیں گے حزنیہ افسانوں میں درد و کرب
کی تکلیف دکھا سکنا قوتِ تحریر و بیان کو ضرور ظاہر کر سکتا ہے لیکن افسانے کا خاتمہ بھی
اگر اسی حالت میں ہو جائے تو ایسا حزنیہ افسانہ بے مقصد ہی ٹھہرتا ہے۔

شعر کی طرح افسانہ ایک نازک قسم کی چیز ہے ہو سکتا ہے کہ شعر کی طرح افسانہ کا
تار و پود بھی بڑی محنت اور اپنی تمام موزونیت کے ساتھ بن لیا جائے پھر بھی اس میں
اس شئے کی کمی رہ جائے جسے شاعری کی دنیا میں "چیزے دگر" کہا جاتا ہے، با لفاظ
دیگر افسانہ کی سب سے بڑی خامی بلکہ ناقابل معافی و تلافی خامی وہ ہوتی ہے جب
اس میں کوئی کسک، کوئی تڑپ محسوس نہ ہو یعنی اس میں اثر یا تاثیر کی کوئی کیفیت پیدا نہ
ہو سکے اسی طرح وہ افسانے بھی جن میں عقلیت بہت زیادہ بگھاری گئی ہو اور اس
وجہ سے ان کا سمجھنا آسان نہ رہا ہو یا جن میں ذہن کی کاوش کے سامنے خونِ جگر کا
فقدان ہو، پبلک اور اچھے رسالوں کے اڈیٹروں، دونوں کے نزدیک لائق توجہ نہیں ٹھہرتے

ایسی کہانیاں جن میں جذبات کی خشکی ہو یا انسانی فطرت کی عکس کشی کا شائبہ بھی نظر نہ آئے مقبول عام ہونا تو درکنار مقبول خواص بھی نہیں ہو سکتیں۔

ایک اور نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے فرض کیجئے آپ نے اپنی کہانی یا کہانیوں کی جائے وقوع کسی اجنبی یا دور دراز کے ملک میں دکھائی ہے جہاں کے حالات، عادات رسوم و رواج، وہاں کے تمدن یا معیشت وغیرہ سے لوگ عام طور پر واقف نہیں ہیں تو ایسے افسانے بھی زیادہ مقبول نہیں ہو پاتے یہ صحیح ہے کہ انسانی فطرت ہر جگہ ایک ہی ہے خواہ وہ دہلی ہو یا ٹمبکٹو لیکن اگر آپ ٹمبکٹو یا ہنولولو میں واقع کوئی کہانی لکھیں گے تو جگہ جگہ اس میں تشریحی نوٹ بھی دینے کی ضرورت پڑے گی تاکہ وہاں کی عام زندگی کے طریقے اور وہاں کا پس منظر آپ کے ناظرین پر بخوبی واضح ہو سکے، اور یہ باعث طوالت ہی نہیں بلکہ ناظرین کیلئے پریشان کن بھی ہے عام طور پر انسان اپنے اردگرد کے لوگوں کی کیفیات اور مسائل سے جو دلچسپی اور ہمدردی رکھتا ہے اور انھیں جتنی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اتنی دور دراز کے مقامات کے لوگوں سے نہیں ۔۔۔ ممکن ہے آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق نہ ہو لیکن جب آپ اس کو برت کر دیکھیں گے تو شاید آپ اس رائے سے اتفاق کر سکیں گے۔

یہاں ایک دلچسپ غلط فہمی کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جو ہمارے اکثر نئے افسانگاروں کو بیماروں کی طرح لاحق ہو جاتی ہے یہ افسانہ نویسی کے شوقین اکثر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اگر کسی افسانہ کی بنیاد براہ راست اور بالتفصیل صداقت پر رکھی جائے تب ہی وہ پسند کیا جا سکتا ہے یا مقبول ہو سکتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ایسی کہانی شاذ ہی مقبول ہو سکتی ہے کیونکہ ہماری اپنی زندگی منظم پلاٹوں کی صورت میں

نہیں کٹتی۔ ہماری واقعی زندگی میں سینکڑوں فضول قسم کی باتیں اور چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کو افسانے میں قطعی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً ہر آدمی صبح دیر سے یا سویرے اٹھتا ہے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہوتا ہے اگر واڑھی نہیں رکھتا ہے تو شیو کرتا ہے اپنے ناشتے کا انتظام کرتا ہے یا اس کے متعلق باورچی اور نوکروں کو ہدایات دیتا ہے یا ہوٹل سے منگواتا ہے سگریٹ یا پان سے شغل کرتا ہے کبھی کبھی غیر متعلق لوگوں سے ملتا ہے یا کچھ غیر متعلق لوگ اس سے ملنے آجاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ یہ تمام چیزیں ہم افسانے میں بیان کرنے نہیں بیٹھ جاتے بلکہ ایسی چیزوں کو نکال دیتے ہیں یاد رکھیے کہ اچھا افسانہ زندگی کا فوٹو نہیں ہوتا افسانہ زندگی کی عکاسی ضرور کرتا ہے لیکن ایک فوٹوگرافر کی طرح نہیں بلکہ ایک مصور کی طرح ہماری اپنی واقعی زندگی تصور کے مقابلے میں زیادہ ناقابل یقین زیادہ ناقابل فہم، زیادہ مبہم، پیچیدہ غیر منطقی بے تکی اور بے ترتیب ہوتی ہے افسانے میں ان تمام بھان متی کا پٹارہ قسم کی چیزوں کا فوٹو کھینچنا افسانے کو افسانہ نہ بنا سکے گا اسی طرح مکالموں میں بھی ہم کو اپنی واقعی زندگی کے مکالموں کی فوٹوگرافی نہیں بلکہ تصویر کشی کرنا چاہیے مناسب انتخاب، کانٹ چھانٹ سے مکالموں کو آراستہ و پیراستہ کیجیے ورنہ آپ کے افسانوں کے مکالمے بے تکے ہو کر رہ جائیں گے حقیقت یوں ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے افسانہ نویس کو ایک فن کار ہونا چاہیے کیونکہ ایک اچھی کہانی کی ساخت دراصل صناعی اور مرصع سازی کا کام ہے مشہور امریکن افسانہ نگار "ایڈگرایلن پو" نے افسانہ کی تعریف ان الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

"افسانہ کی تعریف قطعی طور پر تو نہیں، ہاں ایک مفید تجویز کے طور پر یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک ایسی کہانی ہوتی ہے جو کسی صورت حال کا احساس نہیں

بلکہ تاثر ڈالنے کے لئے شروع کی جاتی ہے اور اولاً ایک تمہید سے پھر اشاراتی
فقروں سے اس مقصد یا تاثر یا انجام کو اشاروں اشاروں میں بتلا دینے
کی کوشش کی جاتی ہے لیکن انجام ابھی ظاہر نہیں کیا جاتا کہانی فضا اور تسلسل
قائم رکھتے ہوئے بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ توڑ کا وقت آجاتا ہے اور انجام
بالکل غیر متوقع اور ڈرامائی طور پر ظہور پذیر ہو جاتا ہے کبھی کبھی خاتمہ سے ذرا
پہلے چند فقرے یا جملے ایسے لکھ دیئے جاتے ہیں جن سے ناظرین کے اضطراب امید
وبیم میں ذرا سا سکون پیدا ہو جائے پھر قصہ یک لخت ختم کر دیا جاتا ہے۔

اگر آپ متذکرہ بالا تعریف پر غور کریں گے تو واضح ہو جائے گا کہ افسانہ نویسی کوئی
آسان کھیل نہیں ہے اس کی ساخت اور پرداخت دونوں کے لئے ایک شاعر کے تصور
ایک نقاد کے دماغ اور ایک انجینیر کی صلاحیت فن درکار ہوتی ہے اس میں ناول کی طرح
"کثرت جلوہ" سے کام نہیں لیا جاتا ایجاز و اختصار، جامعیت اور بلاغت کے علاوہ
مرکزی تاثر کا برابر ذہن میں رکھنا اشد ضروری ہے کبھی کبھی تو ڈراموں کی طرح افسانوں
میں بھی وحدت زمان و مکان و عمل کو باقاعدہ پیش نظر رکھا جاتا ہے لیکن اکثر افسانوں میں
ایک بڑی خامی یہ نظر آتی ہے کہ یا تو تمہید طولانی ہو جائے گی یا خاتمہ اور بیچ کا بیان بہت مختصر
افسانوں میں دراصل ابتدا، وسط اور خاتمے میں قصیدہ کی طرح ایک معقول تناسب پیش نظر رکھنا چاہیئے

افسانہ کسی قسم کا ہو، اس کا انجام یا خاتمہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اگر انجام یا خاتمہ
کمزور قسم کا ہو یا ایسے الفاظ یا انداز میں پیش کیا گیا ہو، جو کچھ اثر، کچھ کھٹک نہیں رکھتے تو سمجھ
لیجئے کہ پورے افسانے پر حرف آگیا میں نے دیکھا ہے کہ بعض اچھے اور محنت اور کاوش سے
لکھنے والے افسانہ نگاروں کے افسانے محض کمزور خاتمے کی وجہ سے اپنا تمام شروع کا زور اور

در و بست کھو بیٹھتے ہیں پو نے ایک موقع پر خوب لکھا ہے کہ اچھے اور زوردار افسانے کو دراصل الٹا لکھا جانا چاہیئے یعنی افسانہ نویس انجام کو پیش نظر رکھتے ہوئے گویا پیچھے قدم بڑھاتا چلا جائے سب سے زیادہ موثر انجام وہ ہوتا ہے جو غیر متوقع ہو۔

اسی طرح کسی افسانے میں جو توڑ کا مقام ہوتا ہے یا جسے اس کی انتہائی اٹھان (کلائمکس) کہنا چاہیئے اسے بھی پہلے سے سوچ لینا چاہیئے اور پورے افسانے کی بنیاد اسی پر قائم کرنا چاہیئے (پریم چند بھی کیا کرتے تھے) اور افسانے کو شروع کر کے اسی مقام پر لانا چاہیئے تاکہ وہ مقصد جو افسانہ نگار اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے واضح ہو سکے اور قائم ہو جائے یہ یاد رکھیئے کہ آپ نے عبارت آرائی اور انداز بیان کے چاہے جتنے جوہر کیوں نہ دکھائے ہوں اگر یہ نقطہ عروج یعنی توڑ کا مقام موثر نہیں ہے تو افسانہ دو کوڑی کا ہو کر رہ جائے گا۔

ایک اور بات پیش نظر رکھیئے وہ یہ کہ اپنے افسانے کو، جہاں تک ہو سکے پہلے تو خوب اچھی طرح سوچ لیجیئے پھر جب لکھنے بیٹھیے تو ایک ہی نشست میں لکھ ڈالنے کی کوشش کیجیئے کیونکہ اس طرح لکھنے سے اس میں آپ کے جذبہ کی وحدت برقرار رہے گی اور افسانے میں ایک ہی موڈ کا قائم رہنا بڑی ضروری چیز ہوتا ہے۔

"ٹکنیک" یا فن افسانہ نگاری کی رو سے ہر قسم کے افسانے کا آغاز بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس پر بہت توجہ دینے کی ضرورت ہے کوشش یہ کرنا چاہیئے کہ آغاز ایسا رکھا جائے جو پڑھنے والے یا سننے والے کے دھیان کو فوراً اپنی طرف مرکوز کر لے آغاز میں آپ پہلے کوئی دلچسپ فقرہ یا تعارفی دلچسپ فقرے اپنے یا اوروں کے تجربے یا مشاہدے کے خلاصے دے سکتے ہیں یا فوراً کہانی شروع کر سکتے ہیں غرض کہ کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہیئے جس سے پڑھنے والا فوراً متوجہ ہو جائے اور پھر آگے بڑھتی ہوئی کہانی کے مطالعے میں محو ہو جائے

ہر اچھی کہانی میں کسی نہ کسی واقعے، حادثے یا تجربے کا بیان تو ہوتا ہی ہے لیکن
سکی بھی احتیاط رکھئے کہ ایک افسانے میں کئی ایک افسانے جمع نہ ہو جائیں اس سے کہانی کے وحدت
تاثر پر برا اثر پڑے گا یعنی پڑھنے والے کا ذہن کبھی یکسو نہ ہو سکے گا اور اسکے دل و دماغ
پر بھی وہ چوٹ "نہ پڑ سکے گی جو محض ایک واقعے سے آپ دینا چاہتے تھے۔

اچھا پلاٹ کیا ہے؟ بقول ارسطو کے "ایک گرہ ڈالنا اور پھر اسے کھولنا" یعنی ایک
پیچیدگی پیدا کرنا اور پھر اس پیچیدگی کو دور کرنا لیکن اس بست و کشاد کے کھیل کو اگر آپ بہت
دقیق کر دیں گے اور بہت سے پیچ ڈالتے جائیں گے کہ ذہن سر تا سر الجھا جائے تو پڑھنے
والا شروع یا بیچ ہی میں بہت گھبرا جائے گا اسلئے اپنے پلاٹ کو بہت پیچیدہ نہ بنائیے دلچسپی
برقرار رکھنے کیلئے اشاروں اور کنایوں سے ضرور کام لیجئے تاکہ قاری کا ذہن اس بات
کا جویا رہے کہ آئندہ کیا ہوگا جاسوسی افسانوں میں تو اس پیچیدگی کے جال کو زیادہ طویل
کیا جا سکتا ہے لیکن دیگر قسم کے افسانوں میں احتیاط رکھئے کہ جال کہیں کا جنجال نہ بن جائے۔
جب جال کی گرہیں کھول دی جائیں تو قاری یہ نہ کہے کہ یہ نتیجہ فضول یا غیر منطقی یا خلاف عادت
یا خلاف فطرت تھا قاری کے ذہن کو انتظار میں رکھنا ایک بڑا فن ہوا کرتا ہے اسی انتظار کو ایک
مناسب حد تک طول دیجئے تاکہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے اور جب اس کاوش انتظار
کو ختم کیجئے تو ایسے فطری اور قدرتی طریقے پر کہ بے جا یا سراسر مصنوعی نہ معلوم ہو۔

ہر افسانہ میں مکالمہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے زیادہ تر افسانے مکالمے کے ذریعہ
ہی پروان چڑھتے ہیں اس لئے مکالموں کے سلسلے میں یہ ضرور خیال رکھئے کہ وہ مصنوعی
یا بے جا طور پر سر تا سر جذباتی نہ ہوں آپ نے آغا حشر اور ان کے عہد کے ڈرامہ نگاروں کے مکالمے
دیکھے ہوں گے۔ کس قدر جذباتی اور مصنوعی ہیں ایسی سستی اور سطحی جذبات یا تصنع کو اپنے

افسانوں کے مکالموں میں جگہ نہ دیجئے بلکہ کوشش یہ کیجئے کہ تصنع کا کہیں شائبہ بھی نظر نہ آئے ہر گفتگو اپنے انداز اور طور طریقے سے فطری اور قدرتی معلوم ہو۔

آخر میں نئے نئے افسانہ نویسوں کو ایک خاص مشورہ بھی دینا ہے کہ اگر آپ اچھے افسانہ نویس بننا چاہتے ہیں تو چند بڑے بڑے افسانہ نویسوں کے چند افسانوں کو ذرا اپنی زبان اور اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کیجئے دیکھئے آپ کس قدر کامیاب یا ناکامیاب ہوتے ہیں اس طرح مشق کرنے سے کچھ نہ کچھ تو آپ کے پلے ضرور پڑے گا ممکن ہے بعض اچھے افسانوں میں آپ کو کہیں کہیں تصنع کی کارفرمائی نظر آئے تو اس سے بددل نہ ہو جائیے کیونکہ دراصل اگر غور کیا جائے تو وہ افسانے مصنوعی اور فرضی تو ہیں ہی کوئی افسانہ ہو، افسانہ ہی تو ہوتا ہے حقیقت تو نہیں ہوتا لیکن ہر اچھا افسانہ حقیقت معلوم ضرور دیتا ہے افسانویت تو درحقیقت ایک کوشش ہے حقیقت تک پہنچنے کی ہم صداقت کو ایک جھوٹ یا فریب کے ذریعہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک مجازی زینہ تیار کرتے ہیں افسانہ بھی ایک مصنوعی ہیئت ہے، اور ہر فنِ لطیف اس طرح کسی نہ کسی حیثیت سے فرضی ہی قرار پائے گا کیونکہ ہر انسانی فن ایک نقل ہوتا ہے اصل نہیں اس لئے اگر کسی بڑے افسانہ نویس کا شاہکار آپ کو کہیں مصنوعی یا فرضی ہونے کا احساس دلائے تو اس سے بیزار نہ ہو جئے کیوں کہ افسانہ بذاتِ خود ہی بڑی مصنوعی صنفِ ادب ہے کمالِ فن یہ ہے کہ نقل اصل معلوم دینے لگے ہر فن کار اپنی نقل کو اصل کا دھوکا یا اصل کا نمایندہ بنانے ہی کی کوشش کرتا ہے آپ بھی اسی کی کوشش کیجئے اور دیکھئے کہ کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔

ادبی جنگ: انشا اور مصحفی کی معرکہ آرائی

دنیا میں معرکے کب نہیں ہوتے اور کہاں نہیں ہوتے دنیا کی تاریخ طرح طرح کی معرکہ آرائیوں کے حالات سے بھری پڑی ہے بلکہ اکثر لوگوں کا خیال تو یہ ہو گیا ہے کہ انسانی زندگی کا دوسرا نام معرکہ آرائی ہے طرح طرح کے مقابلے اور معرکے ہر شخص کو اور ہر قوم کو اپنی بقا کے لئے سر کرنے پڑتے ہیں اپنی بڑائی اور برتری دکھانے کا جذبہ کس میں نہیں ہوتا ہے اسی جذبے یا جبلت کی کار فرمائی ہم کو دنیا کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں نظر آتی ہے اسی جذبے کی خاطر عظیم جنگیں بھی ہوتی ہیں اور خانہ جنگیاں بھی قتل و غارت بھی ہوتا ہے اور آپس کی چھائیں جھائیں بھی، ہنگامے بھی ہوتے ہیں اور تماشے بھی، دنیا میں اسی برتری اور بہتری کی معرکہ آرائی کے بدولت ایک ہما ہمی اور ہنگامہ آرائی قائم ہے ورنہ دنیا سنسان ہو کر رہ جاتی اس سے نقصان بھی ہوتے ہیں اور فائدے بھی اکثر نقصان زیادہ اور فائدے کم لیکن ہوتے ہیں فائدے بھی، طرح طرح کی نئی نئی چیزیں ایجاد ہو جاتی

ہیں، جن سے امن و صلح کے زمانہ میں تمام انسانوں کو بڑے بڑے فائدے نصیب ہو جاتے ہیں کسی زبان کے ادیبوں میں بھی جب کسی قسم کی معرکہ آرائی شروع ہو جاتی ہے تو اس میں نئے انداز نکلنے لگتے ہیں نئے نئے مضامین، نئی تراش خراش، نئی تشبیہیں، اچھوتے استعارے غرضکہ خیال و مضامین کے نئے گل بوٹے ایجاد ہونے لگتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح اس زبان و ادب کو فائدہ پہنچتا ہے اردو زبان و ادب کی تہذیب و ترقی میں اس قسم کے ادبی معرکوں کو بھی کافی دخل ہے مشاعرہ بھی ایک قسم کا معرکہ ہے جس میں شعرائے کرام کے درمیان محض تفریح مقصود نہیں ہوتی بلکہ مقابلہ اور مسابقہ کا بھی شوق دلوں میں پنہاں ہوتا ہے اور کون انکار کر سکتا ہے کہ اس قسم کے مشاعروں یعنی ادبی مقابلوں سے زبان و شاعری کو فائدے حاصل نہیں ہوئے یہ ضرور ہے کہ اب مشاعروں میں متانت اور تہذیب زیادہ پیدا ہو گئی یا یوں کہئے کہ مقابلے کی اسپرٹ کو پر جوش طریقے پر واضح نہیں کیا جاتا ورنہ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی شاعر کسی قسم کی فنی غلطی کر جاتا تھا تو اسے سر محفل ٹوک دیا جاتا تھا اور بڑی لے دے ہوتی تھی کبھی کبھی تو ان مشاعروں میں مجادلے کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی یعنی استاد اپنے شاگردوں اور طرف داروں کو مسلح کر کے مشاعرہ میں لاتا تھا تاکہ موقع پڑے تو زبان کے ساتھ تیغ و تفنگ کے وار بھی آزمائے جائیں اس قسم کے واقعات میں سے ایک انشا اور مصحفی کا معرکہ بہت مشہور ہے دنیا میں ایسے ادبی معرکے کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شروع تیرھویں صدی ہجری یعنی آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ میں اچھے شاعروں کا جمگھٹا تھا اور کئی رئیس ایسے تھے جن کی سرکار دل سے مختلف شعرا وابستہ تھے۔ تنخواہیں مقرر تھیں مشاعرے ہوتے تھے اور مشاعروں کے علاوہ بھی

صحبتوں میں بھی شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا انھیں رئیسوں میں سے ایک مرزا سلیمان
شکوہ کی سرکار بھی۔ یہ سلیمان شکوہ، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے بیٹے تھے لیکن لکھنؤ میں
سکونت اختیار کر لی تھی انشا اور مصحفی دونوں اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے اور
انھیں کی سرکار سے وابستہ تھے ایک دن مصحفی نے اپنی یہ غزل سلیمان شکوہ کے دربار
میں پڑھی غزل پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں
وہی شاعر استاد سمجھا جاتا تھا جو مشکل ردیف و قوافی میں رواں اشعار نکال سکے اور
اسی کی تعریف ہوتی تھی جو اس طرح کی شاعری بآسانی کر سکے مصحفی کی غزل کے چند
اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

سر مشک کا تیرا ہے تو کافور کی گردن — نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن
جھک جھک کے میں ہر چند کئے سینکڑوں مجرے — پر خم نہ ہوئی اُس بُتِ مغرور کی گردن
اک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی مزا ہے — اور دوسرے میں ساقیِ مخمور کی گردن۔
یوں زلف کے حلقے میں پھنسا مصحفی اپنا — جوں طوق میں ہووے کسی مجبور کی گردن

انشاء اللہ خاں بڑے ہنسوڑ اور مسخرے آدمی تھے انھوں نے فوراً اسی مجلس میں
مطلع پڑھا۔

سر اپنے کا تیرا ہے تو انجور کی گردن — ٹڈی کی لگے جس کو نہ زنبور کی گردن

اس مطلع کی بڑی شہرت ہوئی جگہ جگہ لوگ اسے گاتے پھرتے تھے اس کے بعد
انشا نے ایک پوری غزل لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن — رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن
تب عالمِ مستی کا مزا ہے کہ پڑی ہو — گردن یہ مری اس بتِ مخمور کی گردن

اے مست یہ کیا قہر ہے خشتِ سر خم سے　　کیوں تو نے صراحی کی بھلا چور کی گردن
اے دیوِ سفید سحری کاش تو توڑے　　اک مکّے سے خورکے شبِ دیجور کی گردن
آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے　　سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

آخری شعر میں مصحفی پر کھلی چوٹ تھی اب کیا تھا مصحفی کے شاگرد جن کی تعداد بہت تھی انشا کے مقابلے پر اتر آئے جن میں سے خلیق، گرم اور منتظر ان کے خاص شاگردوں نے بڑی کڑوی طویل ہجویں اسی زمین میں لکھیں منتظر کا ایک مصرعہ اس میں سے بہت مشہور ہوا۔ سید انشا اکثر دوپٹہ گلے میں ڈالے رہتے تھے اس طرح کہ ایک سرا آگے اور دوسرا پشت پر رہتا۔ اس کی مناسبت سے یہ مصرعہ کہ ؎

باندھی دُمِ لنگور میں لنگور کی گردن

بہت مشہور ہوا۔

اس ہجو بازی میں ایک دوسرے پر ادبی اور فنی اعتراضات بھی ہوتے جاتے تھے مثلاً انشا اور ان کے شاگرد مرزا سلیمان شکوہ وغیرہ نے مصحفی کی غزل پر یہ اعتراضات وارد کیے کہ لفظ "بلور" حالانکہ تشدید کے ساتھ درست ہے لیکن بغیر تشدید بہتر ہے اس لیے اس کا قافیہ "بلور" نہ لکھنا چاہیے تھا۔ یا گردنِ کافور نہ باندھنا چاہیے اسی طرح "سقنقور" ریگ ماہی کو کہتے ہیں اس کے ساتھ لفظ ماہی، کو نہ لانا چاہیے یا کڑی کمان کو کڑی کمان کہنا غلط ہے وغیرہ وغیرہ اس کے جواب میں مصحفی اور ان کی شاگردوں نے بھی متعدد قطعات اسی بحر و قافیہ میں لکھ کر جتایا کہ "بلور" تشدید کے ساتھ درست ہے تو کیوں نہ باندھا جائے "کافور" سے میرا مطلب سفیدی ہے ٹھنڈک نہیں "سقنقور" لفظ ماہی کے بغیر میں نے نہیں دیکھا اور تم نے جو بغیر اس لفظ کے لکھا ہے وہ غلط ہے اور تم نے

…و غلطیاں کی ہیں ان کا کیا جواب ہے مثلاً یہ "خم بادۂ انگور کی گردن" ٹھیک نہیں
…صراحی کی گردن البتہ ہوتی ہے اسی طرح تم نے جو "شب دیجور کی گردن" باندھی ہے
یہ کیا چیز ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

غرضکہ جب یہ فضیحت بہت بڑھ گئی تو مختلف لوگوں نے کوشش کی کہ کسی طرح
صلح صفائی ہو جائے چنانچہ ایک شب جب سلیمان شکوہ کے یہاں مشاعرے میں یہ دونوں
…ستاد اور ان کے شاگرد جمع ہوئے تو میاں جرأت اور میر اکبر علی نے انشا اور مصحفی کو ملا
…یا تاکہ یہ فتنہ اب زیادہ بڑھنے نہ پائے لیکن یہ صلح ظاہر میں ہوئی باطن میں عداوت
…ی رہی۔

تھوڑے دنوں بعد مصحفی نے پھر ایک اور مشکل غزل سلیمان شکوہ کے دربار میں
…ھی اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

…ہرہ کی جو آئی کفِ ہاروت میں انگلی | کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی
…ندی کے یہ چھلے نہیں پوروں پہ بنائے | ہے اس کی ہر اک حلقۂ یاقوت میں انگلی
…طرب بجے جس وقت کہ تو چھیڑے ہے قانون | ناچے ہے تری عالمِ لاہوت میں انگلی
…شہتوت ہے یا صانعِ عالم نے لگا دی | شیریں کی یہ شاخِ شجر توت میں انگلی

تھا مصحفی یہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

چونکہ زمین بہت مشکل تھی اور مصحفی نے اس میں خوب خوب شعر نکالے تھے اس لئے
…ضرین نے بڑی تعریف کی مگر انشا کا دل چونکہ صاف نہیں ہوا تھا انھوں نے اسکے
…اب میں دو غزلیں لکھیں ایک میں تو مصحفی کی اس غزل پر اعتراضات اور چوٹیں تھیں

اور دوسری میں اپنی کاریگری دکھائی تھی ان دونوں غزلوں کے چند اشعار یہ ہیں ؎

زہرہ کی گئی کب کفِ ہاروت میں انگلی
کب رشک نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

وہ چرخ پہ قیدی یہ کنوئیں میں تھے بچارے

دیکھا ہے کہیں حلقۂ یاقوت جو تم نے
دی ان کی پھنسا حلقۂ یاقوت میں انگلی

پہنچا ہے ہے مخلوق کو خالق کی جگہ پہ
مطرب کی نچا عالمِ لاہوت میں انگلی

تھا مصحفی کا نالہ چھپانے کو پسِ مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

دیکھ اس کی پڑی خاتمِ یاقوت میں انگلی
ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

ناسوت کے عالم میں پے سیر ہم انشا
کرتے ہیں شگافِ درِ لاہوت میں انگلی

صلح و صفائی ہو جانے کے بعد انشا کی دوبارہ یہ ہجو بازی مصحفی کو بہت ناگوار ہوئی بہت ناراض ہوئے اور ان کی اس بدتمیزی کا ذکر دیگر اشرافِ شہر سے کیا۔ سب نے صلاح دی کہ اب تم بھی ترکی بہ ترکی جواب دو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر تو گرم اور منظر وغیرہ نے انشا کے لیے اور انشا نے ان سب کیلئے اسی بحر و قوافی میں بھی، قافیے بدل کر بھی، دوسری بحروں میں بھی قطعات اور مخمسات کی صورت میں بھی غرضکہ طرح طرح سے کیچڑ اچھالا یہ تمام ہجویں اس قدر گندی ہیں کہ ان کی مثالیں بھی پیش نہیں کی جا سکتیں اسی سلسلے میں انشا نے وہ مشہور ہجو فارسی میں لکھی تھی جو بڑی طویل بحر میں ہے اور جسے پورا سنانا مشکل ہے صرف نمونے کے طور پر ایک مصرعہ سن لیجیے یہ خود اپنی جگہ پر شیطان کی آنت ہے۔

"بہ خداوندی ذاتے کہ رحیم است و کریم است و علیم است و حکیم است

وعظیم است وسلیم است وقدیم است وشریف است ولطیف است
وخبیر است وبصیر است ونصیر است وکبیر است ورؤف است وغفور است
وشکور است وودود است ومراخلق نمود است وبود خالق آفاق،
قسم میخواہم اکنون کہ مرا ہیچ زہجو تو سروکار نبود است ولے از طرفین گشت
شروع اینہمہ اقوالِ مزخرف ہشنوائے عرفِ ناداں، اندروہمت شاشۂ عالم۔
یہ ہجو بازی محض زبانی جمع خرچ نہیں تھی، محمد حسین آزاد نے آبحیات میں لکھا ہے کہ مصحفی
کے شاگرد خصوصاً منتظر اور گرم نے حق شاگردی اس طرح ادا کیا کہ ایک دن سب اکٹھے
ہوئے شہیدوں کا سوانگ بھرا اور ہجویں لکھکر انشا کے گھر کی طرف روانہ ہوئے
اور اس کے لئے بھی تیار رہتے تھے کہ اگر مار پیٹ کی نوبت آجائے تو اس سے بھی دریغ
نہ ہو انشا کو پہلے سے اس کی خبر لگ گئی تھی چنانچہ ان کی شوخی دیکھئے کہ اپنے
مکان کو فرش فروش، جھاڑ فانوس سے آراستہ کرایا، شہر کے امیروں کو بلایا اور
بہت سے مٹھائی کے خوان لگائے کشتیوں میں پانوں کی گلوریاں، پھولوں کے ہار لگاکر
رکھوا دیئے اور جب حریفوں کا مجمع قریب آپہنچا یہ اپنے سب ساتھیوں کو لے کر استقبال کو
چلے ساتھ خود تعریفیں کرتے، سبحان اللہ واہ واہ سے داد دیتے سب کو اپنے مکان پر لائے
ان سب کو بٹھایا اور خود دوبارہ پڑھا یا آپ بھی بہت اچھلے کودے مٹھائیاں کھلائیں،
شربت پلائے پان کھلائے ہار پہنائے اور ہنس بول کر عزت واحترام سے رخصت
کیا لیکن پھر سید انشا نے جو اس کا جواب تیار کیا وہ قیامت تھا یعنی برات کی طرح ایک
بڑا مجمع ترتیب دیا اور طرح طرح کی عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں
کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے ایک ہاتھ میں گڈا تھا ایک

میں گرگیا۔ دونوں کو لڑاتے تھے زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے جس کا ایک بند یہ ہے۔

مجھ سے سحر کہہ گئی آکے نسیم چمن ۔ سانگ بنا لائے گا اب کے یہ چرخ کہن
آتے ہیں مجھکو نظر کچھ کڈھب اسکے چلن ۔ گڈا بنائیگا وہ صاف جو ہوں مرد و زن
اور کہے گا یہ ہیں مصحفی و مصحفن

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا (قلمی) میں لکھا ہے کہ جس وقت یہ سوانگ مصحفی کے مکان پر پہنچا منتظر اور کرم استاد کی خدمت میں حاضر تھے ان لوگوں نے تلواریں سنبھال لیں میاں مصحفی نے ان دونوں کے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے اور کہا کہ نواب آصف الدولہ اس وقت شہر سے باہر ہیں ان کی عدم موجودگی میں یہ خانہ جنگی میری بدنامی کا باعث بنے گی مصحفی کے کہنے سے منتظر و کرم خاموش ہو رہے اور یہ خانہ جنگی کسی نہ کسی طرح رک گئی لیکن اسی کے بعد منتظر نے ایک نہایت فحش قسم کا مخمس کہا جو شہر میں بہت مشہور ہوا۔

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ آصف الدولہ جب لکھنؤ واپس آئے اور انھوں نے ان سوانگ بازیوں کا حال سنا تو سخت ناخوش ہوئے اور انشا اللہ خاں کو لکھنؤ سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ انشا لکھنؤ سے چلے گئے لیکن چند دنوں بعد پھر واپس بلائے گئے تھے ان جھگڑوں میں بعض شعروں پر مرزا سلیمان شکوہ کو بھی شبہ ہوا تھا کہ ہم پر بھی شیخ مصحفی نے چوٹ کی ہے چنانچہ اس شبہ کو دور کرنے کی غرض سے مصحفی نے کچھ قصیدے اور کچھ قطعے کہہ کر مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں پیش کئے ایک قصیدہ کے کچھ اشعار یہ ہیں ؎

قسم بہ ذاتِ خدائے کہ ہے سمیع و بصیر ۔ کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں ہوئی نہیں تقصیر
میں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام ۔ رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر

مرادِ ہمن ہے کہ مدحِ حضورِ اقدس کو — الٹ کے پھیر بہ حرف و امید ول تغییر
یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا — کہ بزم و رزم میں ہے ہارے تخت کا وہ تبر
مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا بانی — اگر میں ہوں تو مجھے دیجئے بدترین تعزیر
میں آپ ناحق کش اتنا مجھے کہاں مقدور — کہ تکرار کروں کچھ بغیر آتشیں تشعیر
حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیا — گیا ہوا ہے لئے تشدید شاعران شریر
تو کوتوال ہی بس ان سے اب سمجھ لے گا — یہ جب دام کی شکایت کی ہے خبث تحریر
یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح سارے شہر کے بیچ — ملت تماشی اپنی ہے متہم ہو بصیر
متہم مجھے نادان مانند ہجو منہ سے گیا — قباحت اس کی جو سمجھے تو شہ اسکو دے تعزیر
ولے مزاج مقدس جو لاابالی ہے — نہیں خیال میں آتا خیال حرف حقیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ — زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا پہ چھوڑئے اس بات کو وہ مالک ہے — کرے جو چاہے جو چاہا کیا یہ حکم قدیر

آصف الدولہ کی حضور میں بھی مصحفی نے ذکر کیا اور کچھ قصیدے پیش کئے مثلاً ایک میں کہا ہے

عجب طرح کا زمانے کا ہے یہ لیل و نہار — کہ روز روشن اب آنکھوں میں اپنی ہے شب تار
نہ دوستی ہے نہ شفقت نہ رحم نے انصاف — غرضکہ بغض و جہالت کا گرم ہے بازار
ہنسے نہ کیوں کہ بھلا مجھ پہ چرخ لعبت باز — بنا کے خصم جو گذرا امرا کرے تیار
سلف میں بھی تو مہاجا ہم ہوئے ہیں بہت — پر اس طرح کی نہیں آئی درمیاں تکرار
کوئی زمانے میں اتنا نہیں کہ تجھ سے کہے

فضیحتی ہے یہ کیا اے سپہر بد کردار

ایک طویل مخمس میں اس طرح لکھا ہے

آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جائے امن
گوشے میں پا شکستہ پڑا تھا بوائے امن

اخبار میں لکھا ہی کیا ماجرائے امن
بگڑی نظر پڑے ہے اب اسکو ہوائے امن

جو حکم ہو سو کہیئے کہ مضطر ہے مصحفی

ایسی ہی بدعتیں ہوئیں گر شہر میں عیاں
اہل کمال کا ہے کو کوئی رہے گا یاں

کیا وا کرے گا شعر و سخن میں کوئی زباں
ہوئیں گی شاعروں کی یہ رسوائیاں جہاں

اس ماجرے سے سخت مکدر ہے مصحفی

انشاؔ و مصحفیؔ کا معرکہ تو ختم ہوا اسی طرح کے نہ معلوم کتنے اور معرکوں کے ذکر سے اردو زبان و ادب کی تاریخ بھری پڑی ہے غور کا مقام ہے کہ لفظ و محاورہ و بندش و ترکیب کی خاطر جس زبان میں اتنے معرکے سر ہوتے رہے ہو اس کی سخت جانی میں کسے شک ہو سکتا ہے۔

ریاض خیرآبادی

(ایک ریڈیو فیچر)

[کافی کی پیالیوں کی کھنکنے کی آوازیں جیسے میز پر رکھی جا رہی ہوں]

ایک نسوانی آواز۔ خالد صاحب ابھی تک آپکے دوست احباب نہیں آئے وقت تو ہو گیا۔

خالد۔ آتے ہوں گے بیگم [گنگنانے لگتا ہے پانچ دس سکنڈ کے وقفہ کے بعد]

بیگم خالد۔ کیا گنگنانے لگے ؟

خالد۔ بات یہ ہے کہ چاہے ہو، کافی ہو یا کچھ اور بغیر گنگنائے پینے کا لطف نہیں آتا۔

بیگم خالد۔ تو بھئی سنائیے تو سہی کیا ... [دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے]

خالد۔ (دراز ور سے) آجائیے (دروازہ کھلنے اور دو آدمیوں کے اندر آنے کی آواز

آئیے آئیے آپ لوگوں کی آمد کا انتظار ہی تھا۔

بیگم، آپ علیم صاحب ہیں اور آپ شاہد صاحب ان لوگوں کی صفتیں تو میں تم سے پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔

شاہد۔ بھاوج صاحبہ ہم دونوں اتنی تاخیر سے آنے پر معذرت خواہ ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ ایسے شخص کا ساتھ ہو جائے جس کے دوست احباب قدم قدم پر راستہ روکے ہوں تو دیر ہو جانا لازمی ہے۔ میں نے تو عہد کر لیا ہے کہ آئندہ سے علیم صاحب کے ساتھ کسی کے یہاں نہ جاؤں گا۔

علیم۔ جی ہاں بھائی صاحب! ماشاء اللہ ہے آپ کا سمسٹ قدمی کو نہیں کہتے، بھلا کسی موٹے آدمی کے ساتھ نہ چلا کیجئے (قہقہہ)

بیگم خالد۔ یہاں تو خالد صاحب نے شاید بے صبری کی وجہ سے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔

شاہد۔ اچھا! تو بھئی ہم بھی سنیں گے کیا چیز تھی؟

بیگم خالد۔ شعر تو انھوں نے سنایا نہیں مگر دھن ضرور اچھی تھی۔

علیم۔ گاتے تو خیر یہ ہمیشہ سے اچھا ہیں بھئی خالد صاحب سنا دیجئے۔

خالد۔ میں بیگم سے یہ کہہ رہا تھا کہ چاہے ہو یا کافی ہو یا کوئی اور چیز، بغیر گنگنائے پینے کا لطف نہیں آتا

شاہد۔ بات صحیح ہے مگر یہ کوئی اور چیز کا اشارہ بھی خوب رہا!

علیم۔ ارے بھئی آپ تو وہ شعر جلد سنا دیجئے نا، بے چینی ہو رہی ہے۔

خالد (ہنس کر) شعر اچھا ہے، سنئیے (ترنم سے پڑھتے ہوئے)

جام ہے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

(ہر شخص واہ واہ کرتا ہے)

علیم۔ بھئی کیا شعر کہا ہے

شاہد۔ مزا آگیا۔ پھر پڑھئے۔

(خالد پھر ترنم سے اسی شعر کو پڑھتا ہے)

بیگم خالد۔ یہ کس کا شعر ہے؟

شاہد۔ ارے بھاوج صاحبہ، آپ نے پہچانا نہیں؟

بیگم خالد۔ نہیں۔

شاہد۔ یہ شعر ریاض خیرآبادی کا ہے۔

خالد۔ اور کون ایسے مزے میں کہہ سکتا ہے؟

بیگم خالد۔ ہاں میں نے ان کا نام تو بہت سنا تھا لیکن ان کا کلام سمجھنے کا موقع نہیں ملا۔

علیم۔ بات یہ ہے کہ آپ تو سائنس کی طالب علم رہیں اور یو۔پی سے باہر بھی۔ یہاں لکھنؤ میں تو بچہ بچہ اُن سے واقف ہے۔

شاہد۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں مختصر کچھ ان کا تعارف کرادوں۔

بیگم خالد۔ ہاں، ہاں ضرور۔

شاہد۔ یہیں لکھنؤ سے تھوڑی دور خیرآباد نام کا ایک بہت مشہور اور پرانا قصبہ سیتاپور ضلع میں ہے پرانے زمانے میں تو وہ خود اودھ کا بہت بڑا ضلع تھا بڑا مردم خیز لیکن اب محض ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا ہے غدر سے پہلے یہاں ایک بڑے پایہ کے عالم رہتے تھے مولوی سید طفیل احمد، ریاض انھیں کے بیٹے تھے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے اور شروع میں عربی و فارسی پڑھ ہی رہے تھے کہ شاعری کا شوق ہوا۔ ان کے زمانہ میں لکھنؤ کے تمام گردو نواح میں شعروشاعری کا بڑا چرچا رہتا تھا ریاض بھی اسیر لکھنوی کے شاگرد ہو گئے، اور مشق سخن ہونے لگی لیکن اسیر بوڑھے ہو چکے تھے اور ان کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی اس لئے انھوں نے ان کو اپنے شاگرد رشید امیر مینائی کے سپرد کر دیا اور وہی ریاض کے استاد ٹھہرے ریاض کو شاعری

کے ساتھ اخبار اور رسالے نکالنے کا بھی بڑا شوق تھا چنانچہ پہلے تو خیرآباد ہی سے "ریاض الاخبار" نکالا اور پھر ۱۸۷۹ء میں وہیں سے "گلکدۂ ریاض" ایک ادبی رسالہ بھی نکالنا شروع کیا۔ اس میں اس زمانہ کے مشہور شعراء کے چوٹی کے اشعار پیش کئے جاتے تھے۔ والیان ملک کا بھی کلام چھپتا تھا اس رسالہ سے ان کی بڑی شہرت ہوئی مشاعروں اور والیان ریاست کے درباروں میں اسی کی بدولت یہ بہت معروف ہوگئے لیکن کچھ ہی عرصہ میں یہ اپنا اخبار اور رسالہ لے کر گورکھپور چلے آئے اور ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ کے پیشکار ہو گئے تقریباً پوری جوانی کا زمانہ ان کا گورکھپور ہی میں گذرا یہاں سے انھوں نے کئی اور چھوٹے چھوٹے رسالے فتنہ، عطر فتنہ، صلح کل، وغیرہ نکالے تھے۔ اور ان کے بڑے ہنگامے رہتے تھے لیکن جب انھوں نے پیشکاری سے پنشن پائی تو پھر خیرآباد چلے آئے تھے ۱۹۰۷ء میں مہاراجہ محمود آباد کے اصرار سے لکھنؤ اپنا اخبار لے آئے تھے۔ اور یہاں بھی یہ مختلف رسالے نکالتے رہے راجہ محمود آباد صاحب ان کی بڑی قدر دانی بھی کرتے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد سیتاپور چلے گئے اور وہاں ایک مطبع بھی قائم کیا تھا رینالڈس کے دو ناولوں کے ترجمے بھی حرم سرا، اور نظارہ، کے نام سے کئے تھے غرضیکہ آخر عمر تک شاعری اور اخبار نویسی اور ادب نوازی میں مشغول رہے جولائی ۱۹۳۴ء میں انتقال کیا۔

خالد۔ بھئی شاہد صاحب آپ بہت خشک مزاج لیکچرر ہیں یہ تو محض ایک جغرافیہ آپ نے ریاض کی زندگی کا پیش کر دیا ہے آئیے میں آپ حضرات کو ریاض صاحب سے ملاتا ہوں ذرا ملاحظہ کیجئے۔

(پہلا سین)

(دربار کی ہماہمی۔ بہت سے لوگوں کی موجودگی کا علم ہو)

خالد۔ یہ نواب صاحب رامپور کا دربار ہے۔ ریاضؔ کے رسالوں اور گلدستوں کو دیکھ کر نواب حامد علی خاں صاحب ریاضؔ سے ملنے کے مشتاق ہوئے اور امیرؔ مینائی کے ذریعہ بلوایا ہے دربار میں اس وقت داغؔ مولوی عبدالحق خیرآبادی جلالؔ وغیرہ بیٹھے ہوئے ہیں۔

(دربار میں کسی کی سرگوشی کی آواز) ...... دیکھو استاد امیرؔ مینائی آرہے ہیں مگر یہ کس جوان رعنا کو ساتھ لا رہے ہیں بڑی بڑی مونچھیں۔ داڑھی ندارد!

(امیرؔ مینائی کی آمد کی آہٹ)

امیرؔ مینائی: حضرات ان سے ملئے۔ ریاضؔ خیرآبادی ـــ جاؤ ریاضؔ۔ استاد داغؔ کے پاس بیٹھو میں حضور نواب صاحب سے تمہاری آنے کی اطلاع کر کے ابھی آتا ہوں (امیرؔ مینائی کے جانے کی آہٹ)

چند آوازیں۔ آئیے آئیے ریاضؔ صاحب آئیے۔

(کسی کی سرگوشی)

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاضؔ پر — کس لوک کا جوان ہے کس آن بان کا

ہے ریاضؔ اک جوانِ مست خرام — نہ پیے اور جھومتا جائے

ریاضؔ۔ (ذرا تیز آواز سے) سب حضرات کی خدمت میں تسلیمات بجا لاتا ہوں استاد داغؔ بھی میرا سلام قبول فرمائیں۔

داغؔ (ہنس کر) بھاری پختہ آواز میں! اخاہ آپ ہیں سید ریاض احمد ریاضؔ آؤ

میاں بچھو۔ اماں! تم کو تو یاروں کا شاگرد ہونا چاہیئے تھا کہاں ان فرنگی محلی مولوی صاحب کے پھندے میں پھنسے ہو؟

ریاض۔ (بگڑ کر تیز لہجے میں) جناب! وہ میرے استاد ہیں ان کا ذکر ہی کیا ہے آپ کو دعویٰ ہو تو مجھ ناچیز ہی سے دو دو ہاتھ ہو جائیں بسم اللہ۔ قلم دوات منگوائیے یہاں سب اہل کمال بیٹھے ہیں سب کے سامنے زمین متعین ہو جائے ہم آپ اسی وقت غزل کہہ لیں دیکھیں کون بازی لے جاتا ہے۔

داغ۔ (متانت سے) مولوی عبدالحق صاحب! میں کیا عرض کروں آپ ہی ان صاحبزادے کو جواب دیجئے۔

مولوی عبدالحق۔ (خفا ہو کر) ریاض! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ معلوم ہے کس سے مخاطب ہو تمہارے استاد کے محب خاص برادر بجاں برابر حضرت داغ دہلوی ان کا ادب اور احترام کرنا تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح اپنے استاد کا (اور تیز لہجے میں) اٹھو، معافی مانگو۔

ریاض۔ (بہت نرم لہجے میں) حضرت، چھیڑ تو انھیں نے کی میں نے تو صرف جواب دیا ہے۔

مولوی عبدالحق۔ (اسی تیز لہجے میں) نہیں اٹھو اور معافی مانگو۔

ریاض۔ (اٹھ کر۔ نرم اور لجاجت کے لہجے میں) استاد داغ میں اپنی اس گستاخی پر سخت نادم ہوں۔ میرا قصور درگزر فرمائیے۔

داغ۔ میاں تم اپنے بچے ہو۔ مزاج میں ذرا تیزی ہے اور ماشاءاللہ پھر جوانی بھی میں نے تو محض مذاق میں وہ جملہ کہا تھا تم برا مان گئے۔ خیر، میاں میں نے درگزر کیا۔

[سین ختم ہونے پر پانچ دس سکنڈ کے لئے کوئی گراموفون ریکارڈ بجا دیا جائے]

خالد۔ اب دوسرا سین ملاحظہ کیجئے لکھنؤ کے محلہ جھوائی ٹولہ میں خواجہ فریدالدین عرف ننھن صاحب حضرت ریاض کے بچپن کے دوست ہیں دس پندرہ برس کے بعد ریاض لکھنؤ آئے ہیں کچھ تو خواجہ صاحب اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور کچھ اس لئے کہ ریاض کی صورت بہت کچھ بدل گئی ہے داڑھی بہت لمبی ہو گئی ہے شام کا وقت بھی ہے اس لئے خواجہ صاحب ریاض کو پہچان نہیں سکتے ہیں ریاض سلام کر کے دور ایک مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور کوئی شوخی سوچ رکھی ہے کچھ دیر بعد خواجہ مخاطب ہوتے ہیں۔

خواجہ۔ (ایک بھاری بھرکم آواز) کہیئے حضرت آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

ریاض۔ (ایک خادم کے انداز سے) حضور میں شیخ اصغر علی محمد علی کے کارخانہ سے آیا ہوں آپ کے یہاں عطر اور تیل آیا تھا۔ اس کے چودہ روپے بارہ آنے باقی ہیں۔

خواجہ۔ (خفا ہو کر) کیا کہا! کیسا روپیہ؟ میں نے آج تک کسی جگہ سے کوئی پیسہ قرض نہیں منگائی۔

ریاض۔ میں کیا جانوں حضور۔ شیخ اصغر علی صاحب جھوٹ کہتے ہوں گے

خواجہ۔ (بگڑ کر) ہاں۔ تم بڑے منہ پھٹ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ شیخ صاحب میرے دوست ہیں تم ان کے لئے جھوٹ کا لفظ استعمال کرتے ہو۔

ریاض۔ تو پھر حضور جب وہ جھوٹ نہیں بولتے تو آپ کو روپیہ دینا چاہئے۔

خواجہ۔ (بہت بگڑ کر) یہ آخر آپ ہیں کون صاحب؟

ریاض۔ ایک دفعہ تو عرض کر چکا ہوں کہئے تو کعبہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہوں کہئے تو قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہوں؟

(کوئی اندر آتا ہے۔ پیروں کی چاپ)

خواجہ۔ بھئی ہادی خاں۔ تم خوب آ گئے۔ اماں دیکھو یہ عجب گستاخ آدمی یہاں آ گیا ہے خواہ مخواہ اپنے کو شیخ اصغر علی کا آدمی بتاتا ہے اور مجھ سے ان کا روپیہ طلب کرتا ہے۔

ہادی علی خاں۔ (دھیرے) ذرا غور سے دیکھوں تو (زور سے ہنس کر) ارے اماں فدن تم نے انھیں پہچانا نہیں؟

خواجہ۔ کون!۔۔۔ اخاہ۔۔۔ ارے یار ریاض ہیں لاحول ولاقوۃ اماں یار، تم عجب آدمی ہو!

(سین ختم۔ دس سکنڈ کے لئے کوئی ریکارڈ بجتا ہے)

خالد۔ اچھا بس ایک منظر اور ملاحظہ کر لیجئے ریاض بوڑھے ہو چکے ہیں، خیرآباد میں قیام ہے کبھی کبھی لکھنؤ ضرورتاً چلے آتے ہیں یہاں قیصر باغ میں وصل بلگرامی کے ساتھ رہتے ہیں دیکھئے وہ کچھ کیننگ کالج کے لڑکے ان سے ملنے آ رہے ہیں۔۔ (کچھ لڑکوں کے آنے کی آوازیں)

دو چار آوازیں۔ آداب عرض ہے۔

ریاض۔ (اب انکی آواز بڑھاپے کی وجہ سے کچھ مدھم پڑ گئی ہے) آیئے آیئے آپ لوگ طالب علم ہیں؟

دو تین آوازیں۔ جی ہاں۔

ریاض۔ کہئے آپ لوگ آج ادھر کیسے بھول پڑے؟

ایک آواز۔ کچھ نہیں آپ سے ملاقات ہوئے کئی دن ہو چکے تھے آج سینما سے لوٹ

رہے تھے سوچا کہ آپ کی قدمبوسی حاصل کرتے چلیں۔

ریاض۔ آپ لوگوں کی محبت ہے۔

دوسرے لڑکے کی آواز۔ حضرت آپ نے کبھی سینما بھی دیکھا ہے

ریاض۔ نہیں میاں اتنی عمر گزری کبھی اس قسم کے لہو ولعب میں شریک نہیں ہوا۔

دوسرا لڑکا۔ حضرت چلئے ہم دوسرا شو دکھلائیں عمر میں ایک دفعہ تو دیکھ لیجئے آپ کو بہت پسند آئے گا۔

کئی لڑکوں کی آوازیں۔ ہاں حضرت ضرور چلئے ہماری طرف سے دعوت ہے۔

ریاض۔ (ہنسکر) نہیں بھئی اب اس بڑھاپے میں اور اتنی بڑی داڑھی لے کر کہاں جاؤں گا۔ سینما تم ایسے عمر والوں ہی کے لئے موزوں ہے

دو تین آوازیں۔ نہیں حضرت ہم آپ کو ضرور لے چلیں گے۔

پہلا لڑکا۔ آپ تو بہت آزاد خیال بزرگ ہیں آپ کو ان باتوں کا خیال بھی نہ کرنا چاہیئے سینما کی ایجاد آپ دیکھیں گے کس قدر حیرت انگیز ہے۔

دوسرا لڑکا۔ اور حضرت آپ تو شاعر ہیں آپ دیکھیں گے کہ سینما میں عملی شاعری کا لطف آتا ہے (سب لڑکے ہنسنے لگتے ہیں)

ریاض۔ میاں میں جانتا ہوں تم لوگ شعر سننے آئے ہو تو بھئی ایک بڑا دلچسپ شعر سنو اور مجھے تو معاف ہی رکھو شعر سنتے وقت ذرا میری داڑھی کی طرف خیال رکھنا۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہرِ سینما می روی

زور کا قہقہہ (اور لڑکوں کے واپس جانے کی آوازیں سین ختم دس سکنڈ کیلئے ریکارڈ)

خالد۔ حضرات، یہ حضرت ریاض تھے جن کی سیرت کی ایک جھلک آپ نے دیکھی۔
علیم۔ بھئی واللہ بڑی شوخ اور چنچل طبیعت پائی تھی مگر وہ پینے پلانے والی بات؟
خالد۔ نہیں صاحب توبہ کیجئے عالم اور صوفی منش لوگ تو بے پئے مست رہتے ہیں۔
شاہد۔ (گنگنا کر)۔

شعر تر میرے چھلکتے ہوئے ساغر ہیں ریاضؔ ۔۔۔ پھر بھی سب پوچھتے ہیں کہ آپ نے پی ہو کہ نہیں

خالد۔ بات یہ ہے کہ ریاضؔ کی طبیعت میں شوخی اور خوش طبعی بہت تھی اور قدیم روایات شعری میں شوخی سب سے زیادہ خمریات کے مضامین میں چمک سکتی تھی اس لئے ان کی طبیعت کو اس قسم کے مضامین سے مناسبت ہو گئی اور اسی رنگ میں زیادہ تر کہا اور بہت خوب کہا۔ ان دو شعروں کی سرمستی ذرا ملاحظہ کیجئے۔

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے ۔۔۔ پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں
ہم گرے جب لڑکھڑا کر بزم میں ۔۔۔ سر سبو پر ہاتھ ساغر پر پڑا

سب لوگ۔ واہ واہ
شاہد۔ خوش مزاجی تو ان کی آخر دم تک رہی کوئی کتنا ہی غمگین کیوں نہ ہو ان کے پاس سے خوش و خرم ہی واپس آتا تھا۔
خالد۔ جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ وہ غم روزگار ہو یا غم عشق کسی کے زیادہ قائل نہ تھے
علیم۔ کیا غم عشق سے بھی کبھی سابقہ پڑا تھا؟
خالد۔ ہاں گورکھپور میں کچھ ایسی وارداتیں گزری تھیں جب ہی تو یہ اشعار کہہ گئے ہیں

جوانی جن میں کھوئی ہے وہ گلیاں یاد آتی ہیں
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور آتا ہے

یا

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور — لحد سے آئے گی آواز ہائے گورکھپور
اودھ کی شام، بنارس کی صبح ہو صدقے — کہ اک جہاں سے جدا ہی ادائے گورکھپور

تو خیر میں کہہ رہا تھا کہ غم روزگار ہو یا غم عشق کسی قسم کے غم سے اپنے دل پر انھوں نے میل نہ آنے دیا طبیعت ہر صورت سے آزاد رہنا چاہتی تھی کئی دفعہ حیدرآباد اور رامپور کی طرف سے ملازمت کے اشارے ہوئے مگر یہ ہمیشہ ٹال گئے۔

شاہد۔ مگر آپ کی کیا رائے ہے میرے خیال میں تو باوجود امیر کے شاگرد ہونے کے ریاض ہمیشہ داغ کی تقلید کرتے رہے۔

خالد۔ جی ہاں رنگ تو ضرور داغ کا اختیار کیا تھا مگر داغ تجربہ کار آدمی تھے اور یہ تجربہ سے دور بھاگتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تاثیر کی وہ گہرائی نہیں جو کسی بات کو برتنے سے حاصل ہوتی ہے۔

علیم۔ لیکن طبیعت میں شوخی تو بلا کی ہے وہ آثار کرتی ہے۔

خالد۔ ٹھیک ہے لیکن شوخی وقتی چیز ہوتی ہے اس لیے دل پر زیادہ گہرا اثر نہیں چھوڑتی۔

شاہد۔ لیکن اگر وقتی اثر ہوتا تو پھر ان کے اکثر اشعار زبان زد نہ ہوتے مثلاً یہ اشعار کس کی زبان پر نہیں ہیں۔

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر
اچھی پی لی خراب پی لی — جیسی پائی شراب پی لی
عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف — پانی نہ پیا شراب پی لی
دیکھ واعظ مجھ کو میں کیا ہو گیا — آدمی تھا پانی فرشتہ ہو گیا

وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے ہمراہ — آج جنت میں ہمیں ناصحِ مغفور ملے

لگ گئے دھوکے سے منہ شیخ پھر نہ چھوڑ سکا — پکارتا ہی رہا میں ارے شراب شراب

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن — ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

زاہد کے سر پہ ایک جمائی تڑاق سے — اب ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

(ان اشعار پر وقتاً فوقتاً سب ہنستے ہیں اور آخری شعر پر تو زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)

بیگم خالد۔ خوب یہ شخص کسی کو بھی نہیں چھوڑتا تھا، اپنے کو بھی نہیں۔

شاہد۔ خود کہا ہے ؎ بڑی نٹ کھٹ، بڑی چنچل ہے طبیعت میری۔

خالد۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی شوخی ان کی شاعری کو مقبول بنانے میں مدد دیتی ہے لیکن دراصل یہ ان کی زبان پر قدرت ہے جو ان کے اشعار میں اتنی روانی پیدا کر دیتی ہے کہ ہر خاص و عام کی زبان پر ان کا کلام چڑھ جاتا ہے اور یہ بات اس دور کی خصوصیات میں سے تھی امیرؔ و داغؔ وغیرہ کا کلام دیکھئے ان کی مقبولیت کا راز اسی میں ہے کہ وہ روزمرہ اور عام زبان استعمال کرتے تھے۔

علیم۔ اچھا صاحب یہ نقد و تنقید کی باتیں تو رہنے دیجئے میں تو پڑھنے کے بجائے لطف لینے کا زیادہ قائل ہوں، خالد صاحب آپ کو کچھ اور اشعار یاد ہوں تو سنا دیجئے۔

خالد۔ اچھا سنیے اب ان کے کچھ دوسرے قسم کے اشعار سن لیجئے (گنگنا کر)

بڑھی اس دل کی بیتابی یہاں تک — ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور — نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا — وہی بزم آرائے محشر نہ نکلے

اترنے والے ابھی تک نہ بام سے آئے — تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

کبھی حرف محبت تا بہ لب آیا تو اچکے سے
اسی نے رفتہ رفتہ طول کھینچا داستاں ہو کر

طاقتِ فریاد اب ہم میں کہاں
بات کرتے ہیں کلیجہ تھام کے

اور یہ ایک غزل بھی سن لیجئے (گا کر) :-

خیالِ شب غم سے گھبرا رہے ہیں
ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں

دم وعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ
بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں

قیامت بچھی جاتی ہے ہر قدم پر
یہ کون آ رہا ہے؟ وہی آ رہے ہیں

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدہ میں
عصا ٹیکتے کیا ریاضؔ آ رہے ہیں

(سب ہنسنے لگتے ہیں)

بیگم خالد۔ کیا باغ و بہار آدمی تھا!

خالد۔ جس انجمن میں بیٹھ گیا رونق آ گئی
کچھ آدمی ریاضؔ عجب ڈھنگ کا تھا

(فیڈ آؤٹ)